طالبانِ علومِ نبوت کا مقام
اور
ان کی ذمہ داریاں
(حصہ اول)
حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
www.abulhasanalinadwi.org

طالبانِ علوم نبوت کا مقام
اور
ان کی ذمہ داریاں

(حصہ اول)

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں کی گئی تقریروں کا مجموعہ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مرتب

عبدالہادی اعظمی ندوی

ناشر

سید احمد شہید اکیڈمی

دارِ عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

فہرست

ہندوستان کی شب تاریک میں قندیل رہبانی

(١٥–١٧)

عزم صادق اور اخلاص پر کامیابی کی کلید ہے

خود شناسی اور خدا طلبی

تھوڑے دن کی تکلیف اور ہمیشہ کا آرام

(۴۵-۴۴)

عزم اور اخلاص

عالم اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ

کثرت مطالعہ کی ضرورت

(٧٩-٨٠)

سارا انحصار تمہارے فیصلہ پر ہے

فیصلہ تیرا تیرے ہاتھوں میں ہے......

مدارس کا اصل سرمایہ

ایک بڑی ضرورت
(۱۱۵-۱۱۲)

تقویٰ اور صبر کامیابی کے دو ستون

چار باتیں
(۱۲۵-۱۲۴)

زبان و ادب خدمت دین کا موثر ذریعہ

زبان و ادب سے علمائے دین کا رشتہ

عامی طبقہ کو متاثر کرنے کی صلاحیت پیدا کیجیے!

(۱۴۵-۱۴۲)

حضرت یوسف (علیہ السلام) کے قصہ کا پیغام

زبان وادب کی اہمیت اور اس کی ضرورت

حفاظتِ دین کے مراکز

چراغ سے چراغ جلتے ہیں

فضلائے ندوہ اور ان کی ذمہ داریاں

اپنے کو دنیا کی منڈی میں نہ پیش کیجیے!

تحفظ دین کا عہد کیجیے!

وقت کا جہاد

ناظم ندوۃ العلماء کا پیغام فارغین ندوہ کے نام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ ناشر

تعلیم و تربیت کا جو کام مدارس اسلامیہ نے ہر دور میں کیا ہے، اس سے تاریخ پر نگاہ رکھنے والا ہر انسان واقف ہے۔ ان ہی مدارس نے امت کو وہ افراد فراہم کیے ہیں جنھوں نے مشکل سے مشکل ترین زمانہ میں بھی امت کی رہنمائی کا کام کیا اور کشتی کو بھنور سے نکالنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان ہی مدارس نے امت کو مجددین و مصلحین بھی فراہم کیے، اور علمائے کبار بھی، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان ہی مدارس سے بڑے بڑے مسلمان فلسفی، سائنس داں اور اطباء پیدا ہوئے، فکر اسلامی کے ماہرین اور معتدل مزاج اور فکر رکھنے والے علماء بھی ان ہی مدارس کے فیض یافتہ نظر آتے ہیں۔

اس سلسلہ کی بنیاد زمانۂ نبوت میں پڑ گئی تھی، اور دور بار نبوت سے ملے ہوئے اصولوں کی روشنی میں علم کا یہ سفر جو شروع کیا گیا تھا، ساتویں صدی ہجری میں وہ نقطۂ عروج پر پہنچا اور ساری دنیا میں اس کی روشنی پھیلی، لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ جس جمعیت خاطر اور فکر مندی و اتحاد کے ساتھ یہ عمل جاری تھا، وہ اس طرح جاری نہ رہ سکا اور مسلمان آہستہ آہستہ پیچھے ہوتے چلے گئے، بالآخر زندگی کا سرا ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا، اور مدارس میں جس زندگی اور روح کی ضرورت تھی، اس میں کمی ہوتی چلی گئی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اجتماعی انحطاط کے باوجود اس پورے دور میں (جو کئی سو سال پر محیط ہے) کہ ہمیں وہ بڑی بڑی شخصیتیں بھی نظر آتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ قرون اولی کے کچھ افراد بچے کھچے رہ گئے تھے، جن کو اللہ نے بعد کی صدیوں کے لیے رکھا تھا، جنھوں نے علم و دین کے میدان میں زبردست تجدیدی کام انجام دیے، جن میں ہندوستان کے عظیم مجدد و مصلح حضرت شیخ احمد سرہندیؒ، حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور مجاہد کبیر امیر المومنین حضرت سید احمد شہیدؒ کے نام خاص طور پر نمایاں ہیں۔ لیکن عالمی سطح پر اگر دیکھا جائے تو پوری گہرائی کے ساتھ جو وسعت و کثرت ہمیں ابتدائی آٹھ صدیوں میں نظر آتی ہے وہ بعد

میں نظر نہیں آتی۔ اس کی بنیادی وجہ مسلمانوں کا باہمی انتشار اور علم سے دوری ہے، جس کی
بہت واضح مثال اندلس کی دی جا سکتی ہے جو ایک زمانہ میں علم کا مرکز تھا، لیکن آہستہ آہستہ
وہاں کے حکمران آپس کے جھگڑوں میں ایسے الجھے کہ ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار
ہو گئے، اور ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان کو زیر کرنے کے لیے عیسائیوں سے مدد لینے
میں کوئی عار محسوس نہیں کی، اس کا جو نتیجہ ہونا تھا وہ ہوا، آج کا اسپین کوئی جا کر دیکھے تو وہ خالص
یورپ کا ایک ایسا ملک ہے جہاں کوئی اسلامی شناخت نظر نہیں آتی، علمی مراکز اور بڑے
بڑے ادارے اپنی تباہی پر نوحہ خواں نظر آتے ہیں۔

کئی سو سال کے علمی جمود کے بعد بیداری کا دور آیا، جس کو "نہضت اسلامیہ" کہتے
ہیں، علمی ادارے قائم ہوئے، مدارس دینیہ کی بنیاد ڈالی گئی، خاص طور پر ہندوستان میں
جہاں انگریزوں نے مسلمانوں کو نشانہ بنایا تھا، علماء کو جگہ جگہ تختۂ دار پر چڑھایا گیا تھا، مدارس
کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی تھی، مدارس کا [illegible] فکر کے ساتھ [illegible] مشکل ہو گیا تھا،
علماء نے بڑی ہمت اور دوراندیشی سے کام کیا، لیکن جب ملک آزاد ہوا تو اس کی ضرورت
بڑی شدت سے محسوس کی گئی کہ مدارس میں کچھ نئی روح اور تازگی اور زندگی پیدا کی جائے جو
مدارس کا امتیاز رہا ہے، اور ان کو صرف علوم کے تحفظ کا ذریعہ نہ بنایا جائے، بلکہ ان سے تحفظ
ملت کا کام لیا جائے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قیام کا بھی یہی بنیادی مقصد تھا، مدارس کے اندر اتحاد پیدا کرنا
اور ان کے اندر دین کی صحیح روح کے ساتھ زمانہ کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرنا، اور ایسے افراد تیار
کرنا جن کی امت کو ضرورت ہے، ندوہ نے ایسے جامع افراد کی کھیپ تیار کر دی جنھوں نے
دینی تصلب کے ساتھ حالات کو سمجھا، اور ان سے نبرد آزما ہوئے، نہ صرف یہ کہ سیکھا بلکہ امت کو
سکھایا، ان میں دو نام بہت نمایاں ہوئے، ایک سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندوی کا اور ایک
مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا۔

حضرت مولانا کو ندوہ کی خدمت کا طویل موقع حاصل ہوا، ان کے صرف دور نظامت
کو دیکھا جائے تو وہ تقریباً تیس سال کی مدت پر محیط ہے، یہ ندوہ کی تاریخ کا زریں دور ہے
جس میں ندوہ کی شہرت پوری دنیا میں ہوئی، اور آج دنیا کے مختلف ملکوں میں ندوہ کے فضلاء
علمی و دینی کاموں میں مشغول ہیں، اگر دیکھا جائے تو اس میں حضرت مولانا کے دردِ دل اور فکر
مندی کو خصوصی دخل ہے، حضرت مولانا نے ہر لحاظ سے ندوہ کو مکمل دیکھنا چاہا، اور الحمد للہ اس

بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی

عزیزو! انسانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی زندگی میں اپنے حالات کا وقتاً فوقتاً جائزہ لیتے رہیں، آپ کے منصب اور آپ کی حیثیت کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ آپ کو بار بار یہاں بلایا جائے، اور آپ سے گفتگو کی جائے، لیکن جس طرح پرندہ ساری دنیا سے اپنے آشیانہ کے لیے تنکے چن چن کے لاتا ہے، اور وہ اس بات کو گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کے نشیمن پر کوئی حیا ڈاکہ ڈالے، اسی طرح ہم اس بات کو بالکل پسند نہیں کرتے کہ تمہیں دنیا کے مختلف گوشوں سے آئے ہوئے یہ پرندے ضرر رساں صفات اور عادتوں کو اختیار کریں، اور اپنی رسوائی کے ساتھ ساتھ "آشیانہ" کو بھی نقصان پہنچائیں۔

حالانکہ آپ کے یہاں آنے پر کسی امتحانی توجہ کو قطعاً نہیں ہے، بلکہ اس پر آشوب زمانہ میں آپ کو علم نبوی حاصل کرنے یہاں آنا اور آپ کے قریب ہونے کی دلیل ہے، یہ آپ کے والدین کی عظیم قربانی ہے کہ انھوں نے آپ کے مستقبل کی معاشی اعتبار سے پرواہ نہ کرتے ہوئے آپ کو دین سیکھنے کے لیے وقف کر دیا، اگر ہمارے پاس ایک بڑا ذخیرہ ہوتا تو ہم کو کوئی پرواہ نہیں تھی کہ کتنے بھی ضائع ہو جاتے، لیکن ان حالات میں جب کہ انسانوں کے اس جنگل میں تم جیسے لوگ ملنا ایک بہت تلاش و کاوش کی بات ہو، تم ہمارے لیے گوہر شب چراغ کی حیثیت رکھتے ہو، ہم اس بات کو برداشت نہیں کر سکتے کہ تم میں سے ایک بھی دانہ ضائع ہو جائے، ہم چاہتے ہیں کہ تم میں سے ہر ایک اس زندگی کے میدان میں ایک مرد کامل کی حیثیت سے نکلے اور کارہائے نمایاں انجام دے، ایسی صورت میں جب تم ہمارے خیالات اور توقعات کے برعکس کوئی کام کرتے ہو تو ہم کو بعینہ ایسی ہی تکلیف پہنچتی ہے جیسے کہ

کوئی شخص نہایت محنت ومشقت اور مشکلات برداشت کرکے ایک محل بنائے اور کوئی ظالم اس کو ڈھانے کا ارادہ کرے یا ڈھادے، لیکن ہم اس بات کی بالکل اجازت نہیں دے سکتے کہ تم ہماری امیدوں کے اس شیش محل کو ذرا بھی ضرر پہنچانے کا باعث ہو، نوجوانوں نے تاریخ میں کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، اور زمانے کی کس طرح قیادت ورہنمائی کی ہے، اس کا تم کو اچھی طرح علم ہے، تمہارے سامنے رافع بن خدیج، سمرۃ بن جندب، عمیر بن ابی وقاص، محمد بن قاسم، طارق بن زیاد، محمد فاتح وغیرہ کی اولوالعزمانہ زندگی موجود ہے، اور تم صرف ان کے حالات زندگی کے مطالعہ کرنے والے نہیں، بلکہ ان کی اس تاریخ ساز شجاعت، بہادری، مردانگی، حوصلہ مندی، جرأت گفتار وصلابت کردار کے وارث اور امین بھی ہو، یہ تمہارے آباء واجداد ہیں، تمہارا ان سے نسلی اور ملی رشتہ بھی ہے، اب اگر اولاد صالح اور نیک ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے ان بزرگوں کے نام کو ان کی صفات حسنہ کو اپنے کردار میں جگہ دے کر بلند وبالا اور قائم ودائم رکھے، ورنہ ہم ان کے صحیح وارث کہلائے جانے کے حقدار نہیں ہوسکتے۔

عزیزو! قوموں کی صلاحیتوں اور ان کی عظمت کا دارومدار ان کی جسمانی وضع، فارغ البالی یا ادی کسی مادی تفوق پر موقوف نہیں ہوا کرتا، بلکہ ان کے جذبات وخیالات اور ان کے بلند عزائم پر موقوف ہوا کرتا ہے، کسی بھی قوم کا نوجوان اپنے نئے اور بلند عزائم اور اچھے پاکیزہ جذبات سے قوم میں ایک نیا خون دوڑا دیا کرتا ہے، جب بھی کسی قوم پر کوئی پر آشوب وقت اور نہانی مصیبت آجایا کرتی ہے، اس وقت اس قوم کے نوجوان سنجیدہ ہوجایا کرتے ہیں، وہ اپنے عمل اور اپنے کردار سے قوم کی زندگی میں ایک نئی روح دوڑا دیا کرتے ہیں، آج ایسا ہی پر آشوب دور مسلم قوم پر آپڑا ہے، آج ساری قوم میں ایک مردنی اور مایوسی کی کیفیت چھائی ہوئی ہے، قوم اپنے نوجوانوں کی طرف حسرت اور امید بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہے، آج تم کو چاہئے کہ اپنی قوم کی ان توقعات کو پورا کرو، اور اپنے عمل وکردار سے ثابت کردو کہ مسلم قوم کی کوکھ ابھی سوکھی نہیں ہے، اس مٹی میں نمی کی کسر ہے، اگر اس میں کردار کی حرارت اور اخلاق کی گرمی، قربانی وایثار کی پیدا کردی جائے تو آج بھی یہ مٹی بہت زرخیز ہے۔

نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اور جو صلاحیتیں اور چیزیں تمھارے بزرگوں میں تھیں جو اپنی مخلوق سے اپنے اندر پیدا کرکے اپنی قوم کی باگ دوڑ سنبھالیں، آج مسلم قوم جس نازک دور سے گزر رہی ہے، مسلمان نوجوانوں کو عموماً اور طالبانِ علوم نبوت کو خصوصاً چاہیے کہ وہ اس کا احساس کریں۔

عزیزو! میں پھر کہتا ہوں کہ تم اپنی ماضی کی تاریخ پر نظر ڈالو، اور دیکھو اور غور کرو کہ تم کون ہو، تم محمد بن قاسم کے وارث ہو، تم طارق بن زیاد کے وارث ہو، تمھاری رگوں میں دنیا کے فاتحین کا خون دوڑ رہا ہے، تمھارے تقدس کی فرشتے بھی قسم کھاتے تھے، میرے عزیزو! اپنے بزرگوں کی ثقافت اور ان کی شرافت کو دھبہ نہ لگاؤ، ان کی روحوں کو قبر میں شرمندہ نہ کرو، تمھاری اپنی روشن تاریخ ہے، تمھارا اپنا تابناک ماضی ہے، اور اب تم جس ادارہ میں آئے ہو، اس کی بھی کچھ روایات ہیں، تم اپنی خوش قسمتی سے اس کے بھی وارث بنائے گئے ہو، تم شبلیؔ کے خواب کی تعبیر ہو، تم محمد علی مونگیریؒ کی علمی خدمات کے امین ہو، تم سے کسی بھی قسم کی رکیک حرکت کی شکایت کرنا انتہائی شرم کی بات ہے۔

میرے عزیزو! دیکھو کہ زمانہ تم سے کیا چاہتا ہے، وہ کس قسم کی حرکات کا تم سے متوقع ہے، اگر تمھارے اوپر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ آج کل کے مسائل کو حل کرنے کے لیے اور گتھیوں کو سلجھانے کے لیے کس قسم کی پاکیزہ انگلیوں کی ضرورت ہے، جن کے ذریعہ مسائل کی پیچیدہ گتھیوں کی گرہ کشائی کی جائے، تم یقیناً لہو ولعب سے ہی اجتناب نہیں کرو، بلکہ بزرگوں کی طرح دن رات فکر کے سمندر میں غوطہ زن رہو، اور قوم کا غم تمھیں ایک پل بھی چین سے رہنے نہ دے، کاش کہ یہ غم اور بے چینی تمھاری زندگی کا حصہ بن سکے اور تم دنیا کی نجات کا ذریعہ بن سکو۔ (۱)

---

(۱) ۱۹۶۳ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں کچھ مخصوص حالات پیدا ہو جانے کے سبب منعقد ایک ہنگامی جلسہ میں طلبۂ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سامنے کی گئی تقریر، یہ تقریر مولانا اشتیاق مشہدی ندوی نے قلمبند کی۔ ماخوذ از ہفت روزہ "ایاز" بھوپال، (شمارہ ۱۶/ جون ۱۹۶۳ء)۔

عزمِ صادق اور اخلاص ہر کامیابی کی کلید ہے

عزیز طلبا! آپ کا تعلیمی سال شروع ہو رہا ہے، اور ہر طرح مناسب ہے کہ سال کے شروع میں آپ سے کچھ ضروری باتیں کہی جائیں، اور تعلیم و تعلم کے کچھ مشورے دیے جائیں۔ آپ کو زیادہ نصیحتیں دینے کی ضرورت نہیں کہ جو اچھی سے اچھی باتیں ہو سکتی ہیں، اور زندگی کے سارے مطالعے اور تجربات کا نچوڑ ہو سکتا ہے، وہ آپ کے سامنے رکھا جائے گا۔ اس لیے کہ یہ دولت، یہ قیمتی بات جو برسوں کے تجربے کے بعد حاصل ہوتی ہے اور جو مدتوں سے سینے میں امانت ہے، اگر آپ سے اس وقت نہ کہہ دی جائے تو کس وقت اور کس موقع پر کہی جائے گی؟ میرے نزدیک آپ سے زیادہ اس کا کوئی حقدار نہیں ہے۔

یوں تو باتیں بہت کہنے کی ہیں، لیکن میں جس وقت یہ خیال کرتا ہوں کہ مجھے ان عزیز طلبہ سے خطاب کرنا ہے جو بہت دور سے اپنے سینوں میں بہت سی امیدیں لے کر آئے ہیں، اور جن کے والدین نے بہت سی توقعات وابستہ کر کے ان کو بھیجا ہے، تو مجھے اچھی خاصی کشمکش پیش آتی ہے کہ کیا کہوں اور کیا نہ کہوں، پھر بھی ہر چیز کی ایک خوراک ہے، اگر خوراک سے زیادہ دوا دی جائے تو بجائے فائدہ کے الٹا نقصان ہوتا ہے، میرا تجربہ ہے کہ جب باتیں زیادہ ہوتی ہیں تو انسان کا ذہن ان کو برداشت نہیں کر پاتا، اور وہ ان کو بھول جاتا ہے، اس لیے اگرچہ میرے ذہن میں اس وقت بہت سی باتیں ہیں، لیکن میں ان میں سب سے اہم اور ضروری باتیں کہوں گا۔

سارا دارومدار آپ کی محنت اور طلب پر ہے

پہلی بات یہ ہے کہ عام طور سے جب کسی مدرسہ میں طلبہ کا استقبال کیا جاتا ہے تو ان

سے کہا جاتا ہے کہ اس مدرسے میں آپ کے مقصد کی تکمیل کے لیے ہر قسم کا سامان مہیا ہے، بہترین اساتذہ موجود ہیں، شفیق مربی ہیں، کھانے اور رہنے کا معقول انتظام ہے، اور سب سے بڑھ کر تعلیم کا ماحول ہے، لیکن میں آج آپ سے یہ نہیں کہوں گا کہ اس مدرسہ کی کیا خصوصیات ہیں، یہاں کیسے کیسے فاضل اساتذہ موجود ہیں، تعلیم و تربیت کا کیا سامان مہیا ہے، کتنا اچھا کتب خانہ ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان تمام باتوں کا یہاں معقول ترین انتظام ہے، میں بلا خوف تردید کہتا ہوں، لیکن میں جان بوجھ کر آپ سے یہ باتیں نہیں کہوں گا، اس لیے کہ اس سے وہ قوت ارادی ظاہر نہیں ہوتی جو ہونی چاہیے، کسی طالب علم کے اندر اطمینان کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ سمجھنے لگتا ہے کہ میں جس حالت میں بھی رہوں، ارادہ کروں یا نہ کروں، درس میں محنت کروں یا نہ کروں، منزل مقصود پر بہر حال پہنچ جاؤں گا۔

میں اس وقت اپنے لیے ایک نازک راستہ اختیار کرنا چاہتا ہوں، جو ممکن ہے میرے حق میں مضر ہو، لیکن میں بصراحت کہتا ہوں کہ یہاں جو کچھ بھی ہوگا، وہ آپ کی محنت، جذبہ اور عزم سے ہوگا، اگر مجھے یہ اطمینان ہوتا کہ آپ محنتی اور تعلیم کے حریص پڑ جائیں گے، تو میں کہتا کہ یہاں آپ کو عالم و فاضل بنانے کے لیے یا آپ کی امیدوں کو پورا کرنے کے لیے کوئی سامان نہیں، لیکن اس پر زور دیتے سے اندیشہ ہے کہ معلوم نہیں آپ کیا سمجھیں، آپ میں ہر قسم کے لڑکے ہیں، بڑے بھی ہیں اور چھوٹے بھی ہیں، ذہنوں میں تفاوت ہے، پھر بھی بڑی صداقت سے کہوں گا کہ یہاں جو کچھ بھی ہوگا، آپ کی محنت سے ہوگا، آپ کے جذبہ اور عمل سے ہوگا، اگر آپ کے اندر یہ جذبہ ہے کہ آپ یہاں سے عالم فاضل بن کر جائیں، علوم اسلامیہ کی خدمت کریں، دنیا کے گوشے گوشے میں دین کی اشاعت کریں، علوم اسلامیہ کے کسی شعبہ میں مہارت پیدا کرنا چاہتے ہیں تو یہ آپ ہی کی محنت سے ہو سکتا ہے، اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت نہیں ہو سکتی، میرا تاریخی تجربہ ہے اور آپ بھی جب کسی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوں گے تو آپ کو تاریخ میں جو شخصیتیں ابھری ہوئی نظر آئیں گی، تاریخ میں بھی وہی پہنچے، جس طرح آپ کی زمین اونچی نیچی ہے، اسی طرح تاریخ بھی ہے، تاریخ میں

آپ کو کچھ شخصیتیں نظر آتی ہیں جو آپ کے سامنے مجسم بن کر کھڑی ہو جاتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قد و قامت اور عظمت کے پیچھے ہماری پوری تاریخ چھپ گئی ہے، یہ وہ شخصیتیں ہیں جنھوں نے اپنی محنت وطلب سے یہ کمال پیدا کیا اور جو کچھ بھی حاصل کیا اپنے عزم سے حاصل کیا، بے شک تاریخ میں ان کے اساتذہ کا بھی تذکرہ ملے گا، تاریخ یہ بھی بتائے گی کہ ان پر ان کے اساتذہ کا بڑا احسان ہے لیکن اگر آپ ان کی آواز سن سکیں اور ان کا جذبۂ احسان مندی وتشکر اس کی اجازت دے تو وہ یقیناً یہی کہیں گے کہ عزیزو! اساتذہ کے فیض کا انکار نہیں ہے، لیکن ہمیں جو کچھ ملا ہے ہماری محنت سے اور ہمارے عزم سے ملا ہے، اور تمہارے لیے کارآمد بات یہی ہے، صحابہ کو چھوڑ کر، اس لیے کہ وہ حضور پرنور (ﷺ) کی کیمیا اثر صحبت کا ثمرہ تھے، تم جس فرد کو بھی دیکھو، تمہیں صاف نظر آئے گا کہ جو کچھ بھی کسی کو ملا ہے وہ اس کو اپنی محنت سے ملا ہے۔

عزیزو! تمہارے لیے الجھنے کی بات ہے، اگر اس پورے مجمع میں دو چار دس آدمی ایسے ہوتے جو تمہارے مستقبل کو دیکھ سکتے تو انھیں یہ معلوم ہوتا کہ تم میں جو بھی باکمال نکلیں گے، وہ وہی ہوں گے جنھوں نے آج ہی عزم کر لیا ہے کہ انھیں ساری مشکلات کے باوجود، ساری رکاوٹوں اور دشواریوں کے ہوتے ہوئے، تمام مصائب و آلام کا سامنا کرتے ہوئے باکمال اور صاحب فیض بن کر نکلنا ہے۔

اللہ کا ایک قانون

اگر تمہارے اساتذہ، تمہارے والدین، تمہارا پورا ماحول، غرض کہ دارالعلوم کا ذرہ ذرہ یہ طے کر لے کہ فلاں کو امام غزالی بنانا ہے، اول تو کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا، اور نہ کوئی یہاں امام الحرمین جیسا ہے، جس نے امام غزالی جیسا حجۃ الاسلام بنا دیا، لیکن اگر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سارے ارکان انتظامی بھی یہ طے کر لیں کہ وہ اپنا سارا کاروبار چھوڑ کر، اپنی ساری مصروفیات کو پس پشت ڈال کر زید، عمر، بکر یا کسی بھی طالب علم کو امام غزالی بنا کر دم لیں گے، اور وہ سب کچھ چھوڑ کر یہاں چلے آئیں، اور اللہ کے فضل سے ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے،

ایسے بہت سے اللہ کے بندے موجود ہیں کہ اگر ان کے کان میں ادنیٰ سی بھنک بھی پڑ جائے کہ ان کے یہاں چلے آنے سے ان کا لڑکا اور ان کا چشم و چراغ صاحب فیض ہو جائے گا تو وہ اس میں ادنیٰ تامل نہیں کریں گے، اور فوراً ساری مصروفیات کو خیر باد کہہ کر یہاں آ جائیں گے، اگر اس باغ کا پتہ پتہ اور زمین کا ذرہ ذرہ غرض کہ ساری خارجی اور داخلی طاقتیں مل کر ایک آدمی پر محنت کریں اور چاہیں کہ تم ایک صالح مخلص اور باکمل بن کر نکلو تو ایسا نہیں ہو سکتا، یہ اللہ کا قانون ہے کہ اس نے ہر انسان کے اندر ایسی صلاحیتیں رکھی ہیں کہ جس کو باکمال بننا ہے، اس کے اندر عزم کی صلاحیت بھی ہے، یہ فیض الٰہی ہی نہیں، عدل الٰہی کے عین مطابق ہے، اس نے والدین پر بوجھ نہیں ڈالا، اساتذہ پر ذمہ داری نہیں عائد کی، یہ قانون الٰہی نہیں کہ درخت کوئی لگائے اور پھل کوئی کھائے، جس کو پھل کھانا ہے، اسی کو درخت لگانا ہے اور اس کی آبیاری بھی کرنا ہے، اس لیے میرے عزیزو! یہ تمہاری بڑی ذمہ داری ہے، تمہارے والدین کی دعائیں بے شک مستجاب ہیں، تمہارے اساتذہ کی دعائیں اور دوائیں بے شک کارگر ہیں، کسی مدرسے کا حسن انتظام، کتب خانہ کی وسعت اور خارجی انتظامات ان سب کا اثر پڑتا ہے، لیکن یہ سب مل کر اگر چاہیں کہ کسی کو عالم بنادیں تو نہیں کر سکتے۔

عزم وارادہ

اگر چہ اس وقت میں اس مدرسہ کی حق تلفی کر رہا ہوں، اور اس کے ساتھ ناانصافی کر رہا ہوں، لیکن میں تم سے صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اگر تم یہ سمجھ کر آئے ہو کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ بہت باکمال ہیں، اس کی شہرت بہت زیادہ ہے، یہاں کی سندیں بڑی بڑی جامعات اور یونیورسٹیوں میں مقبول ہیں، یہاں کی تاریخ بہت روشن ہے، اگر تم نے اس میں سے کسی بات پر تکیہ کیا تو تم اسی وقت اس غلط فہمی کو دور کر لو۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے کہ تم میں سے دو چار لڑکے جو اس امید پر آئے تھے واپس چلے جائیں گے، میں صاف صاف کہہ دیتا ہوں کہ اگر تمہارا خیال ہے محض دروس میں شریک ہونے سے، یہاں رہنے سے، یہاں کی کتابوں کی ورق گردانی سے تم منزل مقصود پر پہنچ جاؤ گے، تو اس غلط فہمی کو اسی وقت دور کر لو۔

ہاں اگر تم نے عزم کرلیا ہے کہ اگر یہ سارا ماحول مل کر میری مخالفت کرے، میرے راستے میں روڑے اٹکائے لیکن جب تک میری جان میں جان ہے، میں نے عزم کرلیا ہے کہ یہاں سے باکمال اور صاحب فیض بن کر نکلوں گا، میں وہ شخصیت بن کر نکلوں گا جو اس امت کو اس پُرفتن دور میں مطلوب ہے، یا جاں رسد بجاناں یا جاں زتن برآید، اگر تم نے یہ عزم کرلیا ہے تو تمہارے لیے سب کچھ یہیں ہے، تمہارا مکہ یہیں ہے، تمہارا مدینہ یہیں ہے، شام و مصر کا نام کیا لوں، میں سب کچھ دیکھ چکا ہوں، اور ہر وادی سے گزر چکا ہوں ؎

مرے دیکھے ہوئے ہیں مشرق و مغرب کے میخانے

میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ سرزمین تمہارے لیے متبرک ہے، یہ کنواں جو تم دیکھ رہے ہو، یہ زمزم کا کنواں ہے، یہ مسجد جس کے مینارے ابھر آرہے ہیں، نعوذ باللہ بیت اللہ ہے، ایسا تو کوئی کافر ہی کہہ سکتا ہے، بلکہ یہ ایک عام شہر ہے جو معصیتوں اور آلائشوں سے پر ہے، فتنوں اور ظلمتوں سے پر ہے، لیکن میں ایک بار کہوں گا کہ تمہارا مکہ یہیں ہے، تمہارا مدینہ یہیں ہے، تمہیں مکہ تک پہنچانے والا راستہ یہیں سے ہو کر گزرتا ہے، بلکہ تمہیں علم نبوی کے خزانے تک پہنچانے والا راستہ یہیں ہے۔

اگر تم نے ندوہ کو شیطان کے کان تک پہنچنے کا ایک پل نہیں سمجھا، اگر تم نے یہ نہیں سوچا ہے کہ محمد (ﷺ) کی زبان سیکھ کر، حضرت عمرو حضرت خالد (رضی اللہ عنہما) کی زبان سیکھ کر — جن کی ایک لغزش مستانہ نے ساری دنیا کو ہلا دیا — دنیا کے ٹھیکیداروں کے حصول کا ایک ذریعہ بناؤ، اگر تم بت خانہ کے آزر نہیں بننا چاہتے تو میں تم سے کہتا ہوں کہ تم کو ابراہیم تک پہنچانے والا راستہ یہیں ہے، یہاں سے تم سیدھے بیت اللہ تک جا سکتے ہو، تمہاری عظمت کا خزانہ یہیں ہے، اگر تم نے عزم کرلیا ہے کہ تمہیں یہ خزانہ تلاش کرنا ہے، اپنا خون پسینہ بہا کر اپنے سینہ پر تیشہ چلا کر، تو تمہیں اپنی روزی یہیں ملے گی۔

میرے عزیزو! اسی زمین کے اندر تمہاری قسمت کا خزانہ دفن ہے، اگر تم نکالنا چاہتے ہو تو یہیں سے نکال سکتے ہو، اگر تمہیں کہیں نکالنا ہے تو حرم کی متبرک زمین بھی تمہیں نکال کر نہیں

نہیں ہوسکتا، کتنے ہی علم دوست بلکہ عالم بادشاہ گزرے ہیں، کیا انھوں نے نہیں چاہا ہوگا کہ میرا بیٹا بھی عالم ہو جائے؟ دوررمت جائیے، اورنگ زیب ہی کو دیکھ لیجیے، اشوک و اکبر کے بعد کوئی بھی بادشاہ اتنے بڑے تخت کا مالک نہ رہا ہوگا، اور اتنا بڑا علم دوست اور ذی علم بادشاہ کم از کم دہلی کے تخت پر نہ بیٹھا ہوگا، اس نے ملک کے بڑے بڑے علماء کو جمع کر کے فتاویٰ ہندیہ (جس کو فتاویٰ عالمگیری بھی کہتے ہیں) مرتب کرا دیا، کیا وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا یا نہ کیا ہوگا کہ ان میں چند علماء کو منتخب کر کے اپنے لڑکے اعظم شاہ یا معظم شاہ کی تعلیم پر مقرر کر دے، لیکن ان کی اولاد میں کوئی بھی عالم نہ ہوا، کتنے ہی ایسے علماء گزرے ہیں جو عالم ہونے کے ساتھ ساتھ عالم گر اور عالم ساز تھے، لیکن ان کی اولاد عالم نہ ہو سکی، کیا انھوں نے نہ چاہا ہوگا کہ ان کا بیٹا بھی عالم ہو جائے، اور سب سے آخر میں حضرت نوح (علیہ السلام) کی مثال لے لیجیے، جس کے بعد اور کوئی مثال نہیں ہو سکتی، وہ اپنے بیٹے کو نہ شریک حیات کر سکے اور نہ شریک آخرت۔

میرے عزیزو! تم یہ بات لکھ لو کہ اگر تم نے ارادہ کر لیا ہے کہ یہاں سے استعداد پیدا کر کے نکلنا ہے تو تم انشاء اللہ کامیاب ہو گے، میں دیکھ رہا ہوں، تم میں کچھ ایسے طلبہ ہیں جو اس پر آشوب اور معصیت افزوں دور میں صاحب کمال بن کر نکلیں گے، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس وقت عربی زبان و ادب کا جو نصاب موجود ہے، اس سے بہتر نصاب کبھی ہندوستان میں نہیں تھا، یہ میرے گھر کا موضوع ہے، میں اس سے اچھی طرح واقف ہوں، خود دار العلوم ندوۃ العلماء میں عربی زبان و ادب کا اس سے بہتر نصاب نہیں ہو سکا، جیسا کہ اس وقت ہے، نہ عربی زبان و ادب کے استعمال کرنے والے ایسے تھے جیسے اس زمانہ میں ہیں، جب میں آج سے پچیس سال پہلے خود ندوہ کا نصاب دیکھتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ عربی زبان سے واقف کرانے کے لیے اس نصاب کو کیسے رکھا گیا، لیکن اس نصاب کو پڑھ کر سید سلیمان ندوی نکلے جو علم میں اپنے اکثر اساتذہ سے کہیں آگے تھے، اس نصاب کو پڑھ کر مولانا مسعود عالم ندوی نکلے جن کو خط لکھتے ہوئے ایک بہت بڑے مستشرق نے لکھا کہ میں آپ کو علامہ لکھ رہا ہوں اگرچہ آپ عمر میں مجھ سے بہت چھوٹے ہیں، لیکن آپ کا علم مجھے

علامہ لکھنے پر مجبور کر رہا ہے۔ اسی نصاب کو پڑھ کر مولانا محمد ناظم ندوی نکلے جن کا آج پورے پاکستان میں جواب نہیں، یہ وہ علماء ہیں جن کا عالم عربی کے ادباء لوہا مان گئے، حالانکہ اس وقت عربی کا ماحول نہ تھا، لکھنے پڑھنے کے ایسے وسائل مہیا نہیں تھے، نہ کسی عرب سے ملاقات کی نوبت آتی تھی، مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ مولوی گنج میں ایک عرب آئے تھے تو ہم لوگ شدِ رحال کر کے ان سے ملاقات کرنے گئے تھے، لیکن آج تم بیٹھے ریڈیو سن سکتے ہو، اعلیٰ سے اعلیٰ مضامین پڑھ سکتے ہو، وقتاً فوقتاً عرب وفود سے ملاقات بھی ہوتی رہتی ہے، پھر کیا بات ہے کہ تم میں کوئی مسعود عالم ندوی جیسا اہلِ قلم پیدا نہیں ہوتا؟ اس کا صرف ایک جواب ہے، وہ یہ کہ ان کو ایک جنون تھا کہ عربی کے اعلیٰ سے اعلیٰ معیار تک پہنچیں، ان کو عربی لکھنے پڑھنے سے دلچسپی تھی، اس لیے وہ اپنی منزلِ مقصود پر پہنچے، لیکن آج اتنے سامان ہیں اس کے باوجود تمہاری انشاء کی کاپیاں یا مقالے دیکھتا ہوں تو ڈرنے لگتا ہوں کہ میں خدا کو کیا جواب دوں گا؟ وجہ یہی ہے کہ وہاں عزم تھا یہاں عزم نہیں ہے، وہاں ارادہ تھا یہاں ارادہ نہیں ہے۔

صاحبِ فیض کی صحبت کی ضرورت

میرے عزیزو! دوسری بات یہ ہے کہ علماءِ اسلام نے بلاشبہ اپنی تصنیفات میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا ہے، وہ آسمان سے تارے توڑ کر لائے ہیں، اور ان کو کتابوں میں بند کر دیا ہے، اسلام کو یہ فخر ہے کہ اس امت میں ایسے لاتعداد علماء و مصنفین پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے سمندروں کو کوزے میں بند کر دیا ہے، مصنفین اسلام کی یہ ساری تحقیق و جستجو تسلیم، مگر قرآن و حدیث کو سامنے رکھتے ہوئے میں اعلان کرتا ہوں کہ انسان کے سینے میں جو علوم و فنون موجود ہیں، ان کا ہزارواں حصہ بھی کتابوں میں نہیں آسکا ہے، میری یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ اللہ نے انسان کے ذہن، قلب اور دماغ میں جو کمالات ودیعت کیے ہیں، یہ سارے علوم و فنون ان کی ایک فیصدی بھی ترجمانی نہیں کر سکتے، اس لیے کہ جو کچھ ملتا ہے وہ انسانوں سے ملتا ہے، ہم نے اپنے سارے تجربات کا نچوڑ آپ کے سامنے رکھ دیا ہے اور برابر تمہارے نصاب میں

ضرورت کے مطابق ترمیم کرتے رہتے ہیں، اور ممکن یہ بھی ہے کہ اس زمانہ میں بہتر سے بہتر جو انسان ہو سکتے ہیں وہ موجود ہیں، لیکن سمجھ لو کہ تم کو جو کچھ انسان سے مل سکتا ہے وہ کتابوں سے نہیں، ایک صاحبِ یقین کی صحبت سے، صرف تھوڑی دیر کی صحبت وہ یقین پیدا کر سکتی ہے جو ان مردہ کتب خانوں میں نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تم اپنے دماغ میں علوم و فنون کا خزانہ جمع کر لو لیکن یہ خزانہ بھی انسان کو عجیب بھی بنا سکتا ہے، اگر اس کے صرف کو جانتے ہو تو یہ کسی انسان کی صحبت سے حاصل ہوگا، ہر چیز کو فائدہ مند بنانے والا یہ ذوق ہے، تم بہتر سے بہتر کتابیں پڑھ سکتے ہو لیکن اس کا کیا علاج کہ تم پڑھتے ہو مگر تم میں کوئی اثر نہیں ہوتا، اس کا جواب یہ ہے کہ تمہارے اندر وہ ذوق نہیں۔ تم تاریخ میں نشیب و فراز دیکھتے ہو، کوئی امام غزالی ہے اور کسی کا تم نام بھی نہیں جانتے، کوئی ابن تیمیہ ہے، امام ان کے زمانے میں بہت سے ایسے لوگ تھے جو علم و فضل میں ان سے بڑھے ہوئے تھے لیکن ان کا کوئی نام بھی نہیں جانتا، فرق معلومات کا نہیں ہے، نگاہ اور ذوق کا فرق ہے، وہی کتاب الٰہی (اور کسی کتاب کا نام کیا لوں) شیخ عبدالقادر جیلانی نے پڑھی اور وہی ان کے معاصروں نے، لیکن ان کی عظمت کا راز معلومات نہیں ہیں، وہ فرق مائدہ الٰہی سے کسبِ صلاحیت کا ہے، اور اخذ و اثر کا ہے جو ان کے اندر کتاب اللہ پڑھنے سے ہوتا ہے۔

میرے عزیزو! میں مانتا ہوں کہ تم نے بہت کچھ پڑھ لیا، تم نے تفسیر میں، فقہ میں، حدیث میں مہارت حاصل کر لی، تقریر بھی سیکھ لی، تحریر کی بھی صلاحیت آ گئی، لیکن وہ ذوق کہاں سے لاؤ گے جو قلب میں تاثیر پیدا کر دے اور تم کو تڑپا دے۔

واعظ کا ہر اک ارشاد بجا تقریر بہت دلچسپ مگر
آنکھوں میں سرورِ عشق نہیں، چہرے پہ یقیں کا نور نہیں

اصل چیز یہ ذوق ہے جس سے تم اچھے برے کو سمجھ سکو، اور تم میں وہ اخلاص پیدا ہو جائے کہ تم ہر چیز کو اپنے مقصد کے تابع کر دو، اور یہ چیز صحبت سے حاصل ہوتی ہے، تم سمجھتے ہو کہ چند کتابوں کے پڑھنے سے یا درس میں شریک ہونے سے تم باکمال بن جاؤ گے، ایسا

حاصل کرو، اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرو، اور ہم کو مجبور کر دو کہ ہم لوگ تم سے خود کہنے لگیں کہ اب تم مدرسہ جا سکتے ہو، کسی ایک نحوی نے دوسرے نحوی پر اعتراض کیا تو اس نے جواب دیا: قد ربیت قبل أن تحصرم، تم انگور ہونے سے پہلے پک گئے۔ کہیں تم بھی ایسے ہی نہ ہو جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہاں جانے پر یہ صدا آئے۔

بہ طواف کعبہ رفتم بحرم رہم نہ دادند
تو بروں در چہ کردی کہ درون خانہ آئی

میرے عزیزو! تمہاری صلاحیتوں کا خزانہ کہیں دفن ہے، تم اس کو کھود کر برآمد کر سکتے ہو، اور اس کو اپنے لیے، ہمارے ملک کے لیے، عالم اسلام کے لیے اور پوری انسانیت کے لیے مفید بنا سکتے ہو۔ (۱)

---

(۱) دارالعلوم ندوۃ العلماء میں نئے تعلیمی سال کے آغاز کے موقع پر افتتاحی جلسہ میں ایمانیہ ہال میں ۸ مارچ ۱۹۶۵ء کو کی گئی تقریر، یہ تقریر مولانا عبد العلیم بستوی ندوی نے قلمبند کی، اور مولانا معین اللہ ندوی مرحوم نے [illegible] تعمیر حیات لکھنؤ (شمارہ ۱۰ مارچ ۱۹۶۵ء)۔

خودشناسی اور خداطلبی

بہت بڑی سعادت

بھائیو اور عزیزو! آپ لوگوں نے جن الفاظ کے ساتھ راقم کا خیر مقدم فرمایا اس کے لیے ہم بہت شکر گزار ہیں، درحقیقت یہ بڑی بڑی دولت ہے جس پر ایک دوست دوسرے دوست کو اور ایک عزیز دوسرے عزیز کو مبارکباد دے سکتا ہے، آپ کے سامنے ہمارے سفر کا تذکرہ کیا گیا اس موقع پر اگر آپ کے دل میں یہ خیال آیا ہو کہ ہم اپنے سفر کے حالات سنائیں گے تو یہ بالکل حق بجانب اور فطری بات ہوگی، جب کوئی شخص کہیں جاتا ہے اور خاص طور پر ایسے مبارک سفر پر تو وہاں سے اپنے بھائیوں عزیزوں کے لیے تبرک اور سوغات لاتا ہے، اور خاص طور پر حج سے آنے والوں کا تو قدیم رواج ہے کہ وہاں سے تبرکات لاتے ہیں، مثلاً زمزم، کھجور، تسبیح یا مصلے وغیرہ، ہم کو افسوس ہے کہ ہم اپنے عزیزوں کو یہ تبرکات پیش نہیں کر سکتے، اس لیے کہ یہ ہمارا سفر اس نوعیت کا نہیں تھا۔

اب اگر آپ کو یہ خواہش ہے کہ کوئی سوغات نہ سہی کم از کم وہاں کے حالات و واقعات ہی سنائے جائیں تو آپ اس میں بالکل حق بجانب ہوں گے، لیکن میں اس وقت آپ کے سامنے اپنے یا اپنے ساتھیوں کے حالات تفصیل سے بیان کروں گا اور نہ یہ بتاؤں گا کہ ہم لوگوں نے وہاں کیا کیا؟ اور ہم نے کوئی کارنامہ انجام دیا، وہاں لاکھوں اللہ کے بندے حج کو جاتے ہیں اور ان میں کیسے کیسے اولیاء اور کیسے کیسے خدا رسیدہ بزرگ ہوتے ہیں، ان خدا والوں کے سامنے ہماری کیا حیثیت، لیکن اگر ہم نے وہاں کچھ پایا تو یہ ہمارا فرض تھا، اگر ہم نے وہاں کچھ سیکھا تو ہم نے اسی دن کے لیے عمر بھر پڑھی تھی، اور اس کے لیے ایک عمر چاہیے

میں صرف کی تھی، انسان کی اس سے بڑھ کر اور کیا معراج ہو سکتی ہے کہ وہ عربی سیکھے اور پھر اسی
کے ذریعے دینی علوم وفنون میں مہارت حاصل کرے، اور پھر جو دولت ان سے حاصل کی ہو
بڑی نیازمندی سے سر جھکا کر ان کو پیش کرے اور یہ دولت نہایت ہی تشکر و امتنان کے ساتھ
ان کے قدموں پر ڈال دے اور یہ کہے: "هٰذِهٖ بِضَاعَتُكُمْ رُدَّتْ إِلَيْكُمْ"، اگر ہم نے کچھ کیا
تو یہ ہماری انسانیت کا تقاضا تھا، ہماری شرافت کا تقاضا تھا اور اس خدا کی رحمت کا تقاضا
تھا جس نے ہم کو اس لائق کیا۔ اگر ہم ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں، عضو عضو سے وہاں خدا کی حمد بیان
کریں، اس کے اور اس کے رسول کے احسانات کا اعتراف کریں، اور ہم ہر دو ٹکڑے میں سو سو
زبانیں ہو جائیں اور سب بولنا شروع کر دیں، اور وہ زبانیں بھی سحبان وائل کی طرح ہوں،
اور دن رات شکر خداوندی کے ترانے گائیں، تب بھی ہم اس بارگاہ کا شکر نہیں ادا کر سکتے،
لیکن پھر بھی یہ بہت بڑی سعادت ہے، اور ایک دینی طالب علم کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی
فخر ومباہات کی بات نہیں ہو سکتی۔

آپ کے لیے سب سے بڑی سوغات

ہم نے عرب میں جو کچھ بھی دیکھا اور سنا ہو، اور جو کچھ بھی احساسات ہمارے دل میں
پیدا ہوئے ہوں، لیکن آپ کے لیے یہی سب سے بڑی سوغات ہے کہ آپ اپنی عربیت کو
ترقی دیں اور آپ نے جو دولت پائی ہے اور "لا رب" کے جو دو لفظ سیکھے ہیں، یہ لفظ کوئی
معمولی لفظ نہیں، جس لفظ نے دنیا میں عظیم ترین انقلاب پیدا کیا اور جس سے بڑھ کر باوقار
اور جس سے زیادہ انقلاب انگیز لفظ دنیا کی کسی زبان اور کسی لغت میں نہیں، آپ اپنے اندر
اس کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کریں۔

میرے عزیزو! اگر ان مضمرات پر نظر ڈالی جائے جو تمہارے اندر خوابیدہ ہیں، ان
طاقتوں اور عظیم صلاحیتوں کا اندازہ لگایا جائے جو تمہارے اندر ودیعت ہیں، اور جن سے تم
نہیں ہو، اور اگر کوئی تمہاری ان پوشیدہ صلاحیتوں پر نظر ڈالے تو تمہارے لیے سب سے بڑا
سبق یہ ہے کہ تم اپنے کو پہچانو، اس لعل بے بہا کی قدر کرو جو تمہارے سینے میں چمک رہا ہے، تم

اپنے کو دیکھو، تم میں سے ہر ایک مستقبل میں ایک بڑا عالم، محدث، فقیہ اور مفسر بننے والا ہے، تم اس امانت کی قدر کرو اور پہچانو جو تمہارے اندر ودیعت کی گئی ہے۔

ہمیشہ انسان کی سب سے بڑی ناکامی یہ رہی ہے کہ اس نے موجود کو دیکھا غیر موجود کو نہیں دیکھا، مسافت کو دیکھا رفعت کو نہیں، دیکھا موجودات کو، دیکھا ممکنات کو نہیں دیکھا۔ انبیاء نے انسان کو ہمیشہ یہی سبق دیا کہ وہ آگے کو دیکھے۔ نیز انھوں نے ہمیشہ ممکنات کی طرف ہدایت کی، انھوں نے ہمیشہ اس عالم سے ماوراء کی طرف رہنمائی کی۔ انبیاء کے علاوہ کسی نے یہ سبق نہیں دیا کہ انسان کے اندر کیسی طاقتیں خوابیدہ ہیں؟ وہ کہاں کہاں پہنچ سکتا ہے؟ وہ کہاں کہاں اپنی کمندیں ڈال سکتا ہے؟ وہ کیا کیا آفاق ہیں، علم کے آفاق، محبت کے آفاق، تسخیر کے آفاق ہیں جہاں انسان پہنچ سکتا ہے؟ انسان کی بہت بڑی بدقسمتی رہی ہے کہ ہمیشہ بتانے والوں نے موجودات کا درس دیا، سب نے یہ بتایا کہ وہ کیا ہے، یہ نہیں بتایا کہ کیا ہوسکتا ہے اور کن کن آفاق کی تسخیر کرسکتا ہے؟ یہ ان کی سب سے بڑی خیانت اور کوتاہ نظری تھی، بلکہ اس سے بڑھ کر ایک مجرمانہ سازش تھی کہ انھوں نے اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کو چھپانے کے لیے ہمیشہ یہ دکھایا کہ انسان نے کیا کیا پایا اور کہاں کہاں پہنچا، اور کبھی یہ نہیں بتایا بلکہ کسی نے بتانے کی کوشش کی تو انھوں نے اس بات کو دبانے کی کوشش کی کہ وہ کیا کیا پاسکتا ہے۔ انھوں نے ہمیشہ یہ چاہا کہ انسان موجودات کی طرف دیکھے، اس کے اندر تخیل کا جذبہ پیدا ہونے نہ پائے، انھوں نے ہمیشہ تخیل کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی تاکہ ان کی بے بضاعتی کا راز نہ کھلنے پائے۔

تم کیا کیا بن سکتے ہو؟

میرے عزیزو! تمہاری بدقسمتی ہے کہ تم ہمیشہ یہ دیکھتے ہو کہ لوگ کیا کیا بن گئے اور کہاں کہاں تک پہنچ گئے، تم نے یہ کبھی نہ دیکھا کہ ہم کیا کیا بن سکتے ہیں اور کہاں کہاں تک پہنچ سکتے ہیں، اور پھر اس میں تمہاری پرواز بھی کوئی بہت اونچی نہیں، کبھی تو تم اپنی برادری اور حلقہ سے آگے نہیں بڑھ پاتے، اور کبھی وطن اور معاشرے سے باہر نہیں جاسکتے، تمہارے سامنے ایسی بہت مثالیں ہیں، تم دیکھتے ہو کہ جنھوں نے ذرا سیکھا اور ذرا پڑھی انھوں نے یہ پایا، ان

ان بلند مدارج پر پہنچ گئے، لیکن تم یہ نہیں دیکھتے کہ تم کہاں تک پہنچ سکتے ہو، جنھوں نے اپنے تخیل اور تمناؤں کو زمانے کی ناکامیوں اور پرواز وں کے تابع نہیں کیا، وہ کہاں کہاں تک پہنچ گئے، میری سب سے بڑی کوشش یہ ہے کہ تم سمجھو کہ تم کیا بن سکتے ہو؟ اگر کوئی تم سے یہ کہے یا صرف کہتا ہوا گزر جائے اور اس کی معمولی سے بھنک تمہارے کان میں پڑ جائے اور اس پر بھی تم کو شبہ ہو کہ واقعی کسی نے کہا ہے یا نہیں، کہ فلاں جنگل فلاں درخت کے نیچے یا فلاں کمرے میں ایک دفینہ ہے، تم اس کو کس کس طرح تلاش کرو گے اور کس کس طرح راتوں کو چپکے چپکے کھودو گے کہ کسی کو معلوم نہ ہونے پائے۔

لیکن اگر تم سے کوئی کہتا ہے اور وہ بھی کہنے والا کون؟ خدا کا پیغمبر اور مخبر صادق، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر وہ جس نے خود انسانوں کو پیدا کیا ﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ﴾ [1] اور وہ کہے جو تمہارے رگ و پے سے واقف ہے کہ تمہارے سینوں میں ایک ایسا دفینہ ہے جیسا کسی نے آج تک دفن نہیں کیا اور نہ نکالا، تو پھر تمہارے اندر ایک جذبہ کیوں نہیں اٹھتا اور ایک شرارہ کیوں نہیں بھڑک اٹھتا کہ تم ان کو نکالنے کی کوشش کرو، تمہارے اندر اللہ نے جو صلاحیتیں رکھی ہیں اور جس طرح تم انسانوں اور دنیا کے اندر محبت و معرفت کے اعلیٰ مدارج تک پہنچ سکتے ہو، تم ساری دنیا کو اپنا گرویدہ اور عاشق بنا سکتے ہو، اس کا تقاضا یہ ہے کہ تم اس دفینہ کو نکالنے کے لیے بیتاب اور بے قرار ہو جاؤ، تمہارے اندر کیسے کیسے معلم ہیں، کیسے کیسے مبلغ ہیں، کیسے کیسے ہادی چھپے ہوئے ہیں، تمہارے اندر کیسی کیسی صلاحیتیں ودیعت کی گئی ہیں، تو تمہارے اندر کیوں نہیں ایسا جذبہ پیدا ہوتا کہ تم ان کو بروئے کار لاؤ، تم جب یہاں آئے تو ایک ان گڑھ پتھر تھے، لیکن خدا نے تم پر احسان کیا اور تم عالم ہو گئے، لیکن تم کو یہ نہیں معلوم ہے کہ تم کیا ہو؟ تم یہ نہیں سوچتے کہ تم کیا کیا بن سکتے ہو؟ اور اگر تم کو یہ معلوم ہو جائے، اس میں بھی خدا کی مصلحت ہے کہ معلوم نہیں ہوتا، اور تم اس سے واقف ہو جاؤ کہ دنیا کو تمہاری کس قدر ضرورت ہے، اور دنیا کس قدر تمہاری منتظر ہے، اور تم کیا کارنامہ انجام دے سکتے ہو، تو سچی بات یہ ہے کہ تم اس کو برداشت بھی نہیں کر سکتے۔

---

(۱) سورۃ الملک: ۱۴

وہ عظیم سبب بیان کیا جو دنیا کے سارے درد کا درماں ہے، اور ہر انسان کی زندگی کے لیے مشعل راہ ہے، کیا کہا؟ ﴿إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾ (۱) یہ ایک ایسا عظیم جملہ ہے اور ایک ایسا بامعنی اور پر تاثیر محرک ہے جو ہر انسان کو ترقی کے اعلیٰ منازل پر پہنچا سکتا ہے، اگر میری رائے مان لی جائے تو میں کہتا ہوں کہ تمام مدرسوں اور اداروں کے دروازے پر یہ لکھ کر آویزاں کر دینا چاہیے، انھوں نے اپنے بھائیوں سے کہا کہ تقویٰ اور صبر ایسی طاقت ہے جو نامساعد سے نامساعد حالات میں بھی یوسف علیہ السلام کے درجے تک پہنچا سکتی ہے۔

تم سو بار عرب ہو آؤ، دنیا بھر کی سیر کر لو، اور ڈاکٹریٹ کر لو، کیمبرج اور آکسفورڈ کے طالب علم ہو جاؤ لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ قارون اپنے خزانے کے باوجود، فرعون اپنی سلطنت کے ساتھ، اور نمرود اپنے ان تمام وسائل کے ساتھ اور ذرائع کے ساتھ جو اس کے لیے مہیا تھے، ہمیشہ ناکام رہے، لیکن جن لوگوں نے اخلاص وصبر سے کام لیا وہ کامیاب رہے، دنیا کا بڑے سے بڑا عالم، محقق ناکام، لیکن صاحب اخلاص وتقویٰ وصبر کامیاب، اگر وقت اجازت دیتا تو میں نام لے لے کر کہتا کہ فلاں ادیب ناکام، فلاں مفکر ناکام، فلاں مصنف ناکام، اور یہ وہی لوگ ہیں جن کو تم بہت کامیاب سمجھتے ہو، لیکن اللہ کی نظروں میں ان سے بڑا ناکام کوئی نہیں، تاریخ بتاتی ہے اور دوست ودشمن سب اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ عمرؓ کامیاب اور عمر ابن عبدالعزیزؒ کامیاب، اور دنیا کے سارے ملکوں کے صدر ونائب صدر اور وزیر اعظم ناکام، اصل معیار یہی ہے: ﴿إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾ (۲) ایک غریب جس کے اندر صبر وتقویٰ کا جوہر ہے وہ کامیاب ہے۔ اور اگر یہ نہیں ہے تو چاہے وہ کتنا ہی بڑا آدمی ہو، ناکام ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ اعلان صرف ان کے بھائیوں کے لیے نہیں تھا، یہ قیامت تک کے لیے ہے اور خاص طور سے تمہارے لیے ہے۔ یہ انسان کی ترقی، محبوبیت اور کامیابی، استغناء کا مقام ہے کہ حکومتیں اس کے سامنے جھکتی ہیں اور درخواست پیش کرتی ہیں،

(۱) - (۲) سورۂ یوسف: ۹۰

لیکن ان حضرات کی استغنا کا یہ عالم ہے یہ باتیں سننا گوارا نہیں کرتے اور ان کو دیکھنا پسند نہیں کرتے، وہ خواب میں بھی اس کو دیکھنا پسند نہیں کرتے، اگر ان حضرات کو خواب میں بھی یہ نظر آجائے کہ وہ کسی ملک کے اقتدار پر قابض ہیں، وہ کسی کرسی صدارت پر بیٹھے ہیں تو وہ گھبرا جاتے ہیں، مغفرت طلب کرتے ہیں، خدا سے دعائیں مانگتے ہیں، توبہ و استغفار کرتے ہیں کہ اے اللہ! مجھ سے کون سی غلطی ہوگئی ہے جس کے جرم میں مجھے یہ سزا دی گئی ہے؟

تمہاری قیمت

میرے عزیزو! تم دھوکے میں ہو، تم کو تمہارے ساتھیوں نے دھوکہ دیا ہے، تمہارے دماغوں نے دھوکہ دیا ہے، تمہارے ماحول نے تم کو دھوکہ میں مبتلا کر رکھا ہے، تم یہ سمجھ رہے ہو کہ تم ناکام ہو، اگر تم یہ سوچتے ہو کہ تم ناکام ہو تو تم سے بڑا ناکام کوئی نہیں، وہ اسکولوں اور کالجوں کے لڑکے تم سے زیادہ کامیاب ہیں جن کی نظریں محض دنیا کی طرف ہیں، بھلا وہ اپنے پاس ایک پرزہ بھی رکھتے ہیں، وہ اپنے ذہن میں دوسری زبان کے چند الفاظ تو رکھتے ہیں، لیکن اگر تمہارے پاس وہ جوہر ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس تھا تو تم سے بڑا کامیاب کوئی نہیں، اس کے سامنے یہ حکومت اور دنیا کے خزینے اور قارون کے خزانے کیا چیز ہیں؟ اگر کوئی تم سے کہے کہ تم ناکام ہو تو اس کے ایمان میں شبہ ہے، اس کو اپنے ایمان کی خبر لینی چاہیے، اس لیے کہ قرآن تمہاری کامیابی کی ضمانت دے رہا ہے۔

ایک بزرگ تھے، جونا بور میں ایک مرتبہ ایک خانقاہ میں بیٹھے ہوئے تھے، جاڑوں کا زمانہ تھا، اور سب دھوپ کھا رہے تھے اور جوئیں مار رہے تھے۔ اتنے میں ایک شور ہوا، معلوم ہوا کہ اورنگ زیب کی سواری آرہی ہے، انھوں نے کہا: لاحول ولا قوۃ، میں سمجھا کوئی جوں پکڑی گئی ہے اور اس کو مارا ہے، اورنگ زیبؒ سے اس کا تذکرہ کیا گیا تو اس نے کہا کہ ٹھیک ہے، ان کی نگاہوں میں ہماری اتنی ہی وقعت ہے۔

تاریخ ان واقعات سے بھری ہوئی ہے، ایک بادشاہ آتا ہے خواجہ میر دردؔ کے پاس جو سالک کی حیثیت سے تو کم شاعری کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں، پاؤں میں کچھ درد تھا،

ارادہ کرو کہ تم پڑھ لکھ کر دین اور صرف دین کی خدمت کروگے، اگر ایسا کروگے تو وہی ملے گا جو حضرت یوسف علیہ السلام کو ملا تھا۔ یہ جملہ کسی کے لیے خاص نہیں، بالکل مطلق ہے، ہر عربی جاننے والا اور عربی سے دلچسپی لینے والا اس کے حقائق کو بخوبی سمجھ سکتا ہے، میدان کھلا ہے جس کا جی چاہے تجربہ کرے، یہ ایک نسخۂ اکسیر ہے جس نے اس کو استعمال کیا وہ کامیاب رہا، ہم میں سے ہر شخص نے اس کا تجربہ کیا ہے، تم بھی اس کا تجربہ کرلو، اخلاص پیدا کرو، اور تقویٰ و صبر کی صفات پیدا کرو، پھر کوئی زمانہ ہو، کوئی ملک ہو، اللہ تم کو کامیاب کرے گا، پھر تم کو کوئی شکایت نہیں ہوگی اور تمہاری زبان پر یہ الفاظ ہوں گے: الحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي أَنْجَزَ وَعْدَهُ وَنَصَرَ عَبْدَهُ وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهُ۔

بس میں ان الفاظ پر تقریر ختم کرتا ہوں، اور بجائے اس کے کہ میں اپنا سفرنامہ بیان کروں، میں دعوت دیتا ہوں، اور دعا کرتا ہوں کہ تم اس لائق ہو جاؤ کہ خلق خدا تم سے وابستہ ہو، کہ تم خود اس سفر کے لائق بنو، راستہ کھلا ہے تم میں سے ہر ایک اس کو آزما سکتا ہے، لیکن صرف تقویٰ و صبر، محنت و ہمت کی شرط ہے، کامیابی کا راز اسی میں پوشیدہ ہے اور یہی سنۃ اللہ ہے، ﴿فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيلًا﴾۔(۱)

---

(۱) ۱۹۶۵ء میں سفر حج سے واپسی کے بعد طلبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے دیے ہوئے ایک عصرانہ میں کی گئی تقریر، یہ تقریر مولانا عبد العلیم بستوی ندوی نے قلمبند کی، ماخوذ از "تعمیر حیات" لکھنؤ (شمارہ ۱۰ رجون و ۱۰ رجولائی ۱۹۶۵ء)۔

تھوڑے دن کی تکلیف اور ہمیشہ کا آرام

عزیز بچو! تم اس ملت کے نونہال ہو جس کے قیام میں بڑی قربانیاں پیش کرنی پڑی ہیں، تم اس باغ کے پھول ہو جس کو اللہ والوں نے اپنے خون سے سینچا ہے، تم اس دین کے علم و عمل کے طالب ہو جس کے لیے انبیاء (علیہم السلام) نے تکلیفیں اٹھائیں اور صحابہ کرام نے قربانیاں پیش کی ہیں، تم کو اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنا ہے، اور اپنے مقام کی لاج رکھنی ہے، بڑے بزدل ہیں وہ لوگ جو مورچہ پر جانے والے سپاہیوں سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ افسوس تم ایسی جگہ جا رہے ہو جہاں گولیاں چلیں گی، توپیں دغیں گی، بم برسیں گے، اور تمھاری جان کو خطرہ ہی خطرہ ہوگا، ایسے موقع پر بہادری اور صحیح ہمدردی یہ ہے کہ اپنے زوربیان سے سپاہیوں کو قربانی کے لیے بےقرار کر دیا جائے، اسی طرح تم خود فیصلہ کرو گے کہ بڑا بدخواہ ہے وہ شخص جو تم سے یہ کہے کہ بڑا ظلم ہے تم پر کہ صرف و نحو بھی لاد دیا اور انشاء و ادب پر بھی مجبور کیا، انگریزی اور فارسی بھی لازم کی، ریاضی اور تجوید کو بھی ضروری کیا۔

اسی طرح میں تم کو بتاتا ہوں کہ ہرگز وہ تمھارا ہمدرد نہیں جو تم سے زمانہ طالب علمی کی پابندیوں پر اظہار افسوس کرتا ہے۔

عزیزو! میں یا تمھارے ماسٹر عرشی صاحب تم میں سے کسی کو کسی خاص کام کے لیے منتخب کریں تو منتخب کیا جانے والا خوش ہوگا کہ مجھے اہل سمجھا گیا، اسی طرح تمھیں فخر کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو اس پرآشوب دور میں، اس فتنہ کے زمانہ میں اپنے دین کے علم کا طالب بنایا، عزیزو! غور کرو برگد کا درخت کتنا بڑا ہوتا ہے اور اس کا بیج کتنا چھوٹا، اب اگر کوئی کہے کہ برگد کے اس ذرا سے بیج میں برگد کا بہت بڑا درخت ہے تو تعجب معلوم ہوگا، لیکن اگر کوئی قسم

میں تمہارے ماسٹر صاحب سے سفارش کروں گا کہ وہ تمہارے لیے کتاب "علمائے سلف" مہیا کریں، جس میں تم دیکھو گے کہ جس نے جس قدر مجاہدہ کیا، اتنا ہی پھل اس کے حصہ میں آیا۔

بس تمہارے کام کے لیے اتنی باتیں بہت کافی ہیں، خلاصہ یہ کہ تھوڑے دنوں اپنے دل کی چاہتوں کو دور کر کے محنت کرو، پھر ان شاء اللہ ہمیشہ باعزت رہو گے اور آرام اٹھاؤ گے، لیکن اگر یہ زمانہ تم نے غفلت میں گزارا تو ندامت و حسرت کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا، نہ صحیح اردو بول سکو گے، نہ صحیح عربی پڑھ سکو گے، نہ صحیح خطبہ دے سکو گے، نہ کام کی تقریر کر سکو گے، نہ مسئلہ بتا سکو گے، نہ تاریخ پر گفتگو کر سکو گے، نہ ادب میں کوئی مقام حاصل کر سکو گے۔

اب تمہیں فیصلہ کرنا ہے تھوڑے دن کی تفریح اور ہمیشہ کی رسوائی پسند کرتے ہو یا تھوڑے دن کی تکلیف اور ہمیشہ کا آرام؟

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمین۔[1]

(۱) [illegible] دارالعلوم ندوۃ العلماء [illegible] طلبہ [illegible] تقریر [illegible] رشید احمد صدیقی [illegible] ۱۹۷۵ء [illegible]

عزم اور اخلاص

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۝ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۚ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا﴾[1]

مطالعۂ تاریخ کے دو ردِ عمل

عزیز دوستو اور بھائیو! ہم آپ تاریخ کی کتابیں پڑھتے ہیں، علم و فن کی تاریخ ہو، مذہب و اخلاق کی تاریخ ہو، سلطنتوں کی تاریخ ہو، سیاست و تمدن کی یا انسانی ذہانت اور جس کی صلاحیتوں کی تاریخ پڑھنے کے دو اثر ہوتے ہیں، ایک اثر تو یہ ہوتا ہے کہ ہم میں ان گذشتہ لوگوں کی تقلید کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، ہمارے اندر بھی حوصلہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم بھی ان کا راستہ اختیار کریں اور ان کے نقش قدم پر چلیں، دوسرا اثر یہ ہوتا ہے کہ آدمی جب ان کے کارنامے پڑھتا ہے جو بعض اوقات اس کے دماغ اور اس کے ذہن کی سطح سے بلند ہوتے ہیں تو اس کے اندر مایوسی پیدا ہوتی ہے کہ اب ایسے کمالات کہاں پیدا کیے جا سکتے ہیں؟

زہد و ورع، روحانیت اور روحانی پیشواؤں کی تاریخ پڑھیے، بزرگانِ دین کی سوانح عمریاں پڑھیے اور تصوف و سلوک کی تاریخ پڑھیے تو اس سے دوسرا یہ اثر ہوتا ہے کہ یہ تو پرانے زمانے کی باتیں ہیں، وہ معلوم نہیں کس دل و دماغ کے انسان تھے، معلوم نہیں ان کو کیا دیا گیا تھا، کس مٹی کے وہ انسان تھے جو فرشتوں سے بازی لے گئے اور انھوں نے کس طرح

---

(۱) بنی اسرائیل: ۲۰-۲۱

نفس کشی کی، کس طرح اپنی اصلاح کی اور کس طرح اس مادیت کی بلکہ حیوانیت کی سطح سے بلند ہو کر وہ ملکوتی صفات ان کے اندر پیدا ہو گئیں اور وہ فرشتوں سے بازی لے گئے۔

اسی طرح اگر آپ علماء کے تراجم پڑھیے تراجم کی کتابوں، تذکرہ کی کتابوں میں، تو بہت سے لوگوں پر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بس اب یہ دور ختم ہو گیا اور یہ ورق الٹ گیا۔ اب نہ ایسے باکمال پیدا ہوں گے نہ ایسے کمالات کوئی پیدا کر سکتا ہے۔ اخلاقیات کے میدان میں آئیے تو ان حضرات کی بے نفسی، خلوص، للّٰہیت، بے غرضی، استغناء، زہد، بڑے بڑے سلاطین کو خاطر میں نہ لانا، اور دنیا کی بڑی سے بڑی دولت اور وجاہت کو ٹھکرا دینا اور آنکھ اٹھا کر اس کی طرف نہ دیکھنا، اس کے واقعات کثرت سے تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ کوئی کتاب آپ اٹھا لیجیے تذکرہ اور تاریخ کی، تو آپ کو زیادہ ورق گردانی اور تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی، آپ کا کتب خانہ ایسی سینکڑوں بلکہ ہزاروں کتابوں سے بھرا ہوا ہوگا، بلکہ آپ کا کتب خانہ "اصلاح" بھی اس سے خالی نہیں ہے، یہ ایک نتیجہ ہے جو انسان ہر دور میں نکالتا ہے کہ اب کیا ہوگا؟ یہ مادیت کا دور ہے، قوی کمزور ہو گئے ہیں، ہمتیں پست ہیں، زندگی کے تقاضے بہت ہیں، اس کا معیار بہت بلند ہو گیا ہے، زندگی کے لیے جدوجہد کرنی پڑتی ہے تب جا کر کہیں پیٹ بھرنے کا سامان میسر ہوتا ہے۔

اور آپ دیکھیں گے اور میں نے ایک مرتبہ "الاصلاح" کی تقریر میں بھی یہ کہا تھا کہ ہر زمانہ کے شعراء نے اپنے دور کا ماتم کیا ہے، اور اپنے دور کی زبوں حالی اور اہل کمال کی گمنامی اور ان کی ناقدری کا شکوہ کیا ہے، خواجہ حافظ ہوں یا شیخ سعدی ہوں یا عمر خیام ہوں، سب اپنے زمانہ سے بدتر کوئی زمانہ نہیں تھا اور ان کے زمانے میں گویا خاک اڑتی تھی، کچھ رہا ہی نہیں تھا، نہ کوئی اہل کمال کا قدرداں تھا، نہ کوئی علم کی قدر و قیمت باقی رہی تھی، سب ایک کسمپرسی کی حالت میں پڑے تھے، لیکن اسی دور کے اہل کمال کے تذکرے آپ پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ اس زمانہ میں کوئی انقلاب نہیں آیا تھا، اور کوئی چیز بھی ان کے راستہ میں مزاحم نہیں ہوئی تھی، اور نہ ان کو اپنے زمانہ کا شکوہ ہے اور نہ اہل زمانہ کو ان سے کوئی شکایت۔

کوئی دور اہل کمال سے خالی نہیں

میں سمجھتا ہوں کہ کوئی دور بھی ایسے شعراء سے اور ایسے شکوہ سنج لوگوں سے خالی نہیں رہا کہ انھوں نے اپنے زمانہ کا ماتم نہ کیا ہو، مگر کوئی دور بھی اہل کمال سے خالی نہیں رہا، ایک طرف یہ ہوتا رہا اور دوسری طرف اہل کمال بھی پیدا ہوتے رہے، اب ہمارا یہ زمانہ آیا، اس زمانہ میں سب سے زیادہ دور دورہ ہے زوال کے تقاضوں کا، اور ایک ہی حقیقت رونق ہے لوگوں کے نزدیک، وہ سمجھتے ہیں کہ اس زمانہ میں کچھ ہو ہی نہیں سکتا، اور کسی چیز میں کمال نہیں پیدا کیا جا سکتا، ایک ہی میدان رہ گیا ہے اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا، اور وہ میدان ہے معاشی میدان یا سیاسی میدان۔

اب آپ یہاں دارالعلوم میں آئے ہیں، بہت سے لوگ تو بغیر کسی شعور کے آئے ہیں، جنھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کہاں جا رہے ہیں، اور اس دارالعلوم کی کیا تاریخ ہے؟ اور کیا مقاصد ہیں؟ یہاں کس طرح کے آدمی پیدا کرنا مقصود ہے؟ اور بہت سے بھائی ایسے ہیں جو کچھ سمجھ کر آئے ہیں اور ان کے اندر کچھ شوق ہے لیکن سب کے دماغ پر یہ بات ہے کہ اس زمانہ میں کیا ہو سکتا ہے؟

کوشش کا نتیجہ ضرور نکلتا ہے

میں نے جو آیت پڑھی ہے، وہ آیت اسی مقصد کے لیے پڑھی ہے کہ اس میں ہمیں زندگی کا بہت بڑا ایک پیغام ملتا ہے، بہت بڑی طاقت، ایک نئی قوت ہمارے اندر یہ آیت پیدا کرتی ہے، اور بہت سے مغالطوں کو دور کرتی ہے کہ امتحان کی جو شکلیں ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے جو چیز یہاں سنت قرآن میں ذکر ہوتا ہے، اس کا جو معاملہ ہے اس دنیا کے ساتھ، اپنے بندوں کے ساتھ، وہ معاملہ بالکل اٹل ہے، ازلی ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں، فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللهِ تَبْدِيلًا[۱] اتنی تاکید کے ساتھ اتنے زور کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس کو بیان کیا

(۱) سورۃ الاحزاب: ۶۲

ہے، بار بار قرآن مجید میں یہ مضمون آیا ہے: ﴿فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا﴾ (۱) اللہ تعالیٰ اگر فرما دیتا کہ سنت الٰہی میں کوئی تغیر نہیں ہے تو بھی کافی تھا، لیکن اتنا زور دے کر فرمایا ہے، یہ ایک انسانی کمزوری ہے کہ وہ جب تبدیلی دیکھتا ہے تو اس کے ذہن میں یہ آتا ہے کہ اب سنۃ اللہ بدل گئی ہے، اپنے اندر تبدیلی دیکھتا ہے، اپنے محلّے میں تبدیلی دیکھتا ہے، اپنے محدود خاندان میں تبدیلی دیکھتا ہے، اپنے ارادوں میں تبدیلی دیکھتا ہے، ہمت میں تبدیلی دیکھتا ہے اور کہنے لگتا ہے کہ سنۃ اللہ بھی بدل گئی ہے، یہ انسان کی پرانی کمزوری ہے، اس کا ظہور مختلف شکلوں میں، ادب میں، شاعری میں، جدوجہد کے میدان میں، دینیات میں، سب میں ہوا ہے، تو یہ انسان کی پرانی بیماری ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اس پر زور دیا ہے، اس کو زور کی ضرورت نہیں ہم کو زور کی ضرورت ہے، وہ اس خیال کو بالکل دور کرنا چاہتا ہے کہ سنن الٰہیہ میں، قوانین ازلی میں، اور فطرۃ اللہ جسے کہا گیا ہے، اس میں کوئی تغیر و تبدل ہو سکتا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کی کوشش میں، انسان کے ارادے میں بڑی طاقت رکھی ہے، اللہ تعالیٰ غنی ہے، سب جانتے ہیں ہمارا آپ کا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات غنی ہے، اس کو کسی چیز کی ضرورت نہیں، لیکن اس نے کچھ چیزیں طے فرما دی ہیں کہ ایسا ہوتا ہے، اس میں کوئی فرق نہیں، اس میں سے ایک طے شدہ قانون یہ ہے کہ انسان کی کوشش کو بے نتیجہ نہیں رکھتا، یعنی انسان کوشش کرے اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلے، ایسا کبھی نہیں ہوتا: ﴿وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى، ثُمَّ يُجْزٰهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى﴾ (۲) اور یہ ﴿ثُمَّ يُجْزٰهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى﴾ کو میں سمجھتا ہوں، میری ناقص فہم میں یوں آتا ہے کہ اَلْجَزَآءَ الْاَوْفٰى میں دنیا اور آخرت دونوں ہی شامل ہے، دنیا میں بھی ہے اور آخرت میں بھی، اور آخرت کے لیے بھی، آخرت کا تو کہنا ہی کیا، سارا قرآن شریف اس سے بھرا ہوا ہے کہ انسان کی کوشش رائیگاں نہیں جاتی اور اس کو اس کی کوشش کا پھل ضرور ملتا ہے۔

---

(۱) سورۂ فاطر: ۴۳ (۲) سورۃ النجم: ۳۹ - ۴۱

یہ وہ حوصلہ بڑھانے والی طاقت ہے جس نے زندگی کے بڑھانے والے پہیے کو ہمیشہ گردش میں رکھا، اور اس نے انسانی صلاحیتوں کو ہمیشہ تازیانہ کا مہمیز کا کام دیا، اور ہمیشہ اس کے لیے جیسے انرجی (Energy) ہوتی ہے، اس طرح اس نے ہمیشہ انسانی نفسوں میں، انسانی صلاحیتوں میں، اور ہر زمانہ کے انسانوں میں، ایک نئی امنگ، ایک نئی طاقت، ایک نیا حوصلہ، ایک نیا جذبہ پیدا کیا۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اتنا بڑا انعام دیا ہے انسانوں کو، اتنا بڑا اعزاز بخشا ہے، اتنا بڑا تاج ان کے سر پر رکھا، خلافت الٰہی کے تاج کے بعد اس سے بڑھ کر میں کوئی تاج نہیں سمجھتا، خلافت اور نبوت کے تاج کے بعد اس سے بڑا کوئی تاج نہیں ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ انسانیت کو اس سے زیادہ کسی چیز نے اتنا فائدہ نہیں پہنچایا کہ انسانی کوشش کا ضرور نتیجہ نکلے گا۔

آپ دیکھیں گے کہ دنیا کی پوری تاریخ، تہذیب وتمدن کی تاریخ، صنعت وحرفت کی تاریخ، علم وفن کی تاریخ، اخلاق کی تاریخ، اصلاح اور تجدید کی تاریخ، حق وباطل کی کشمکش کی تاریخ، دنیا کو تباہی سے بچانے کی جو وقتاً فوقتاً کوششیں ہوتی رہیں، نسل انسانی کو تباہی سے بچانے کی جو بار بار کوششیں ہوتی رہیں، آپ دیکھیں گے ان کے اندر سب سے بڑھ کر قوت کارفرما تھی، ایمان کی قوت کے بعد یہی اعتماد اور یہی بھروسہ تھا اور خدا کی اس بات پر یقین کہ کوشش کا نتیجہ ضرور نکلتا ہے، اگر یہ نہ ہوتا تو ہم کو اور آپ کو ایک مٹھی بھر جو، ایک دانہ غلہ نہ ملتا، ایک بیج ہم کو آپ کو نہ ملتا، اور یہ روٹی کا ٹکڑا جو ہم کو نصیب ہوتا ہے، ہم اس سے بھی محروم رہتے اگر کسان کے اندر یہ یقین نہ ہوتا، خواہ تجربہ کی بنا پر ہو، خواہ عقیدہ کی بنا پر ہو، خواہ مشاہدہ کی بنا پر ہو، خواہ اللہ کی بات پر یقین کرنے کی بنا پر ہو، بہرحال کسان کے دل میں یہ یقین ہے کہ وہ مٹھی بھر جو بیج ڈالتا ہے زمین میں، وہ زمین جس کو بیج سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا، بظاہر وہ تو بیج کو کھا جانے والی ہے، وہ تو مٹی ہے، خشکی سراپا خشکی، اور بیج زندگی سے بھرپور، اس زندہ چیز کو اس مردہ چیز کے سپرد کیا جاتا ہے، زندگی کی امانت موت کے سپرد کی جاتی ہے، سرسبزی وشادابی اور نمو کی صلاحیت کو خشکی اور خشک کر دینے والی چیز کے سپرد کیا جاتا ہے، کوئی جوڑ نہیں

اس کی تاویل نہیں ہو سکتی کہ انسان وہاں تک پہنچ سکتا ہے، انسان آسمان کے تارے توڑ کر لا سکتا ہے، انسان آسمانی بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے، اور انسان قدرت کے رازوں کا انکشاف کر سکتا ہے، انسان ان طبعی طاقتوں کی تسخیر کر سکتا ہے، ہوا کے دوش پر اڑ سکتا ہے۔

یہ تو میں نے طبعیات کے میدان کو لیا ہے، اخلاقیات میں آپ دیکھیے، تو آپ کو ان حضرات کے جنھوں نے اخلاقیات کو اپنا میدان بنایا، اپنے نفس کی اصلاح کو اپنا میدان بنایا، تہذیب نفس کو اور تزکیۂ نفس کو انھوں نے اپنا میدان بنایا، اپنے نفس کے نا جائز تقاضوں کو اور بہیمی تقاضوں کو مغلوب کر کے اور اللہ کے بندوں پر یقین کرتے ہوئے اپنے اندر ایمان، اخلاق حسنہ فاضلہ جاگزیں کرنے اور ترقی کرنے کے میدان میں جن لوگوں نے کوشش کی، ان کے اخلاق کی لطافت کو، ان کے اخلاق کی بلندی کو، ان کے اخلاق کی نزاکتوں کو، ان کے اخلاق کے اس لوک لچک کو، ان کے اخلاق کی اس نزاکت کو سمجھنا بڑے بڑے شعراء کی نظموں سے ان کو سمجھنے، ان سے بڑے نکتہ آفریں مضامین سمجھنے سے زیادہ مشکل معلوم ہوتا ہے، اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہی انسان جس کے ساتھ معدہ لگا ہوا ہے، اور جس کے ساتھ نفسانی خواہشات لگی ہوئی ہیں، اور جو اکثر شیطان کا بالکل مرکب بن جاتا ہے، اس سے شیطان وہ وہ کام کراتا ہے کہ جس کے سامنے جانور بھی اپنے کان پکڑیں اور وہ بھی شرمندہ ہو جائیں، یہ انسان ان بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے، عبادت کے میدان میں دیکھیے تو آپ کو صرف اسلام کی تاریخ میں — اور مذاہب کی تاریخ نہ تو اتنی محفوظ ہے اور نہ اتنی دور جانے کی ضرورت ہے — اگر آپ صرف اسلام کے عابدوں کی، شب زندہ داروں کی اور زاہدوں کی تاریخ پڑھیں تو حیرت ہوتی ہے کہ انسان عبادت کے میدان میں اتنی ترقی کر سکتا ہے، اتنا اپنے نفس پر قابو پا سکتا ہے، اتنی اس کو لذت و حلاوت حاصل ہو سکتی ہے، اس کے اندر اتنا خشوع و خضوع پیدا ہو سکتا ہے، اس کے اندر اتنی یکسوئی پیدا ہو سکتی ہے، وہ اس عالم میں ہونے کے ساتھ اس عالم سے اتنا غیر متاثر ہو سکتا ہے، اس کے اندر گویا اقبال کے الفاظ میں کے وقتوں کی تپش، اس کی شبوں کا گداز یہاں تک پہنچ سکتا ہے، رقت قلب کے واقعات پڑھیے، خشوع و خضوع کے واقعات پڑھیے، ان کے

استغراق کے واقعات کو پڑھیے تو انسان کی عقل اس کو آسانی سے قبول نہیں کرتی۔

اب علم کے میدان میں آیئے، آپ دیکھیں گے کہ انسان نے علم کو اپنا میدان بنایا، اس میں مسابقت شروع ہوئی، اس میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش پیدا ہوئی، اور اس میں اپنی صلاحیت کو صرف کرنے کا انسان کے اندر شوق پیدا ہوا تو پھر انسان نے علم کے میدان میں وہ ترقی کی کہ انسان کی عقل میں وہ باتیں آسانی سے نہیں آتیں کہ انسان کا حافظہ اتنا قوی ہوسکتا ہے، انسان کا سینہ اتنا فراخ ہوسکتا ہے، انسان کا یہ دماغ، یہ کاسۂ دماغ ایک بالشت بھر بھی اس کا رقبہ نہیں ہے، اور ایک مٹھی میں وہ آسکتا ہے اس کے اندر اتنی قوت برداشت پیدا ہوسکتی ہے، اس کے اندر اتنا تنوع پیدا ہوسکتا ہے کہ کتب خانوں کو اپنے اندر وہ اتار نے، ایک علم نہیں، دو علم نہیں، پچاس پچاس، ساٹھ ساٹھ، ستر ستر علوم میں اتنا کمال پیدا کر سکتا ہے انسان۔

شاعری کے میدان میں آیئے، فی البدیہہ شاعری کو آپ دیکھیے، حاضر جوابی، حاضر دماغی کو آپ دیکھیے، دماغی شادابی کے واقعات کو آپ دیکھیے تو ایک ایک فن میں انسان نے وہ ترقی کی ہے مثلاً برجستہ شعر کہنے کو یا مثلاً تاریخ نکالنے ہی کو لیجیے، بالکل صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ الہام ہے، اسی طریقہ سے ساری تاریخ ہم کو یہ بتاتی ہے کہ انسان نے جس میدان کی طرف رخ کیا، اور جس میدان کو سر کرنے کا عزم پیدا ہوا، اور طلب صادق پیدا ہوگئی، عزم راسخ پیدا ہوگیا، اور اس نے سمجھ میری کامیابی کا راز اسی میں ہے، اور اس نے سمجھا میری سعادت ہے کہ میں اس میدان میں ترقی کروں، تو خدا کی مدد اس طرح سے آئی کہ آدمی حیران رہ گیا۔

﴿نُمِدُّ﴾ کے معنی

اور یہ ﴿كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَاۗءِ وَهٰٓؤُلَاۗءِ﴾[1] آپ لوگ تو عربی کے طالب علم ہیں، آپ سے کہتا ہوں: ﴿نُمِدُّ هٰٓؤُلَاۗءِ﴾ کے معنی یہ نہیں کہ ہم سب کی امداد کرتے ہیں، عربی

(۱) سورۃ الإسراء: ۲۰

ہونا چاہیے، ان کتابوں کو پڑھ کر ہمارا یقین، ہمارا ایمان، ہمارا حوصلہ تازہ ہونا چاہیے کہ جو مالک ماضی میں ہمارے اسلاف کو دیتا تھا، وہ اس زمانہ میں جیسے بڑے عالم پیدا کرسکتی تھی، وہ اب بھی پیدا کرسکتی ہے۔

آج بھی اللہ تعالیٰ اپنی ان تمام صفات کے ساتھ ہے، ہم اور آپ بدل گئے، ہمیں تو زمانہ کے بھی بدلنے کا قائل نہیں، ہم اور آپ بدل گئے، ہم اور آپ لینا نہیں چاہتے، ہمتیں پست ہوگئی ہیں، ہم نے اپنی ترقی اور محنت کا میدان بہت محدود اختیار کیا ہے، جس میدان کو منتخب کریں گے اللہ تعالیٰ اس میں مدد فرمائے گا، اگر ہم نے یہ طے کرلیا ہے کہ وقت کا ساتھ دے کر اور اس زمانہ کے دستور کے غلام بن کر کچھ حاصل کرنا ہے تو ہم کو وہی لمبا راستہ اختیار کرنا پڑے گا جو دوسروں کی محتاجی کی طرف لے جاتا ہے، جس طرح قوم سبا کا حال تھا، قوم سبا کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام کیا تھا کہ وہ یمن سے چلتے تھے اور شام پہنچ جاتے تھے، وہ راستہ بھر باغ ہی باغ، چمن ہی چمن، ان کو جنگل وصحرا کی گرم ہوا اور کانٹوں سے واسطہ ہی نہیں پڑتا تھا، شیطان نے ان پر حسد کیا اور انھوں نے کہا: ﴿رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا﴾[1] اے پروردگار! ہمارے سفروں کو دور دور بنادیجیے، تو خدا نے سارے چمن کو ختم کردیا اور پھر انہیں خارزاروں اور صحراؤں سے واسطہ پڑا۔

آپ سیاست کے میدان میں، الیکشن کے میدان میں دیکھیے، اس کا موسم عنقریب یہاں آنے والا ہے، لوگ اس میں کس طرح کھانا پینا بھول جاتے ہیں، اپنی نیند حرام کرلیتے ہیں، کس طرح ان میں طاقت برداشت پیدا ہوجاتی ہے، جو کہیں بڑے بڑے زاہدوں کے یہاں نظر نہیں آتی، ایک ایک آدمی الیکشن سے دلچسپی رکھنے والا اپنے مقصد میں فنا ہوجاتا ہے، دیوانہ ہوجاتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے، کھانے پینے اور آرام کی فکر سے بے نیاز، مارا مارا پھرتا، گالیاں سنتا، کئی پشتوں تک تبرا ہوتا ہے اور چار چوٹ کھا کر پشتوں کو معاف نہیں کیا جاتا مگر الیکشن کے امیدوار صاحب ہنسی خوشی اس کو سنتے ہیں کہ قوت برداشت، بے نفسی کی ایک مثال قائم ہوجاتی ہے، مگر جب مقصد کا غلبہ ہوجاتا ہے تو یہ سب چیزیں آسان بن جاتی ہیں، مجاہدہ

---

(1) سورہ سبا: ۱۹

اور کسی نے وہ وہ کمالات دکھائے جو اولیائے بے نفس کا شعار رہتے ہیں، مقصد کا فرق ہے، مگر بات وہی ہے کہ کسی مقصد کو سامنے رکھ کر اس میں ڈوب جانا اور ہر قسم کی مشقتوں کو برداشت کرنا۔

علم کے کمالات بھی لوگوں کو حیران کر دیتے ہیں، جو لوگ کسی سائنسی ایجادات میں، کسی لیبورٹری میں، تجربہ گاہ میں کام کرتے ہیں تو ان کے واقعات کا آپ کو یقین نہ آئے کہ آدمی کھانا پینا بھول سکتا ہے، ان کو یہ پتہ نہیں رہتا کہ سورج کہاں سے نکلا اور کہاں ڈوبا؟ صبح کب ہوئی اور شام کب آئی؟ گھر میں بچے کی لاش پڑی ہوتی ہے اور سائنس کا تحقیق کرنے والا اپنے کام میں منہمک ہے۔

یہی انہماک شطرنج کھیلنے والوں تک میں آپ پائیں گے، گھر سے بار بار اطلاع آتی ہے کہ بچہ بیمار ہے، کسی حکیم یا ڈاکٹر کو بلوا دیجئے، مگر جواب ملتا ہے کہ ذرا ایک بازی اور ہو جائے، پھر خبر آئی کہ بچے کا انتقال ہو گیا اور یہ شطرنج کی چالوں میں بدستور غرق رہے۔

انسان کا استغراق اور انہماک

جہاں تک انسان کے استغراق کا اور انہماک کا تعلق ہے، جہاں تک انسان کے اپنے مقصد کے پیچھے پاگل بننے کا تعلق ہے، آپ کو ہر طبقہ میں اس کے واقعات ملیں گے۔

یورپ اور امریکہ کے لوگ جنہوں نے بجلی، ریڈیو، ریل گاڑی، ٹیلیفون اور دنیا بھر کی نئی چیزیں ایجاد کیں، نظریہ اضافیت اور ایٹمک انرجی کو دریافت کیا، آئن اسٹائن وغیرہ ان کے اگر آپ دماغی استغراق اور جسمانی انہماک اور مجاہدے کے واقعات اپنے میدان کے پڑھیں یا سنیں، آپ کو یقین کرنا مشکل ہو جائے، تو آپ ان واقعات کو انسانوں کے نہیں بلکہ جناتوں کے قصے کہیں، اسی طریقہ سے جس میدان کو انسان انتخاب کرے، اور اس کو اپنی محنت کا مرکز بنائے، اور اپنی توجہ مرکوز کرے، اور پھر کوشش شروع کرے، تو محیر العقول نتائج ظاہر ہوں گے، یہ سنت اللہ ہے۔

اولیائے کرام کے آپ حالات پڑھیں تو ان کے اپنے نفس پر قابو پانے کے واقعات ہمارے، تصور فہم میں آنا مشکل ہو جاتے ہیں، امام ابوحنیفہؒ کے متعلق آتا ہے کہ چالیس برس تک عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کرتے رہے، آدمی کی آنکھ جھپکے اور ذرا بھی غنودگی آئے کہ اس کا وضو جاتا رہے، یہی ایک واقعہ ایسا ہے کہ جو زبردست مجاہدہ کا طالب ہے، متعدد اہل اللہ کے ایسے واقعات ہیں، اور ان میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، ہمیں اس پر پورا یقین ہونا چاہیے، مادی میدانوں میں کوشش کرنے والوں کا استغراق وانہماک نا قابل فہم اور نا قابل یقین حد تک ہوتا ہے تو یہ تو اولیاء اللہ تھے۔

اب میں آپ سے کہتا ہوں، ببانگ دہل کہتا ہوں، اور ہر جگہ اعلان کرنے کے لیے تیار ہوں، اللہ تبارک وتعالیٰ اب بھی مدد کرنے کے لیے تیار ہے، مدد نہیں امداد غیبی معنوں میں، اللہ تعالیٰ اب بھی جھولی بھر دینے کے لیے، مالا مال کر دینے کے لیے تیار ہے، اس کا اعلان ہے اور اب بھی اس کی یہ سنت جاری ہے، صرف ہمارے اور آپ کی طرف سے یہ کمی ہے۔

مغرب کی ترقی کا راز

آج مادیت کی ترقی کا راز یہ ہے کہ اعلیٰ صلاحیت اور ذہانت کے مالک ذہن پورے انہماک اور لگن کے ساتھ اس میدان میں لگے ہوئے ہیں، آج مغربی علوم، سائنس، ٹیکنالوجی کی ترقی اور یورپ کی سیادت کا راز کیا ہے؟ آج مغربی زبانوں کی ترقی کا راز کیا ہے؟ کیا اس کا راز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ التفات اپنے پیغمبروں اور ان اولیاء اللہ کی اولاد سے پھر گئی جنہوں نے فاقہ کرکر کے علم کی خدمت کی، لوگوں کو جہنم کے راستے سے ہٹا کر جنت کے راستے پر ڈالا، دوسروں کے لیے اپنی رات کی نیند حرام کی، پیٹ پر پتھر باندھے، دنیا کی کسی نعمت کا مزہ نہیں چکھا؟ کیا اللہ تعالیٰ ان کی نسلوں اور پشتوں پر اتنا ناراض ہوا؟ کیا ان اولیاء اللہ کو ان کی محنتوں کا یہ صلہ ملا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی پشتوں کو محروم کر دیا اور یورپ پر اللہ تعالیٰ کی ایسی نظر عنایت ہوئی، حالانکہ کون سا کام یورپ نے اچھا کیا؟ کیا یورپ کے اعمال ان ہی نعمتوں

کے مستحق ہیں؟ یورپ کے لوگ جو آج تمام دنیا پر چھائے ہوئے ہیں، کیا ان کے بزرگ
بڑے عابد وزاہد تھے؟ ولی اللہ تھے؟ ذرا "تاریخ اخلاق یورپ" پڑھیے، ڈریپر کی کتاب
"معرکۂ مذہب و سائنس" پڑھیے، دوسروں کا تو کیا ذکر ہے جو خدا کا نام تک نہیں جانتے
تھے، جو مذہب کے ٹھیکیدار بنے بیٹھے تھے ان کے اعمال کو دیکھیے، کلیسا کے نمائندوں کے مظالم
کو آپ پڑھیے تو بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، کیا یہ اعمال اللہ تعالیٰ کو اتنے پسند تھے
کہ علم و سیادت، حکومت و شوکت سب ان ہی کو دے دیا؟ اور ہمارے اعمال اتنے خراب تھے
کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو غلام بنا دیا، ہم میں انحطاط ہے، ہمارے سماجی، تعلیمی، سیاسی نظام میں
زوال ہے، اور کوئی جرجانی، غزالی، رازی نہیں پیدا ہوتا، وہاں نہ معلوم کتنے
ایڈیسن (Addison) اور آئن اسٹائن (Einste.n) اور نیوٹن (Newton)، بیکن
(Bacon) اور ہر فن کے مجتہد اور صاحب کمال پیدا ہو رہے ہیں۔

چند؟ یہ پہیلی بوجھو، وہ قوم جو عیسائی ہے بلکہ حقیقی عیسائی بھی نہیں۔ جو دو دو عالمی لڑائیاں
لڑ چکے ہیں اور ساری دنیا کو ختم کرنے کے درپے ہیں، دنیا کے ہر گناہ اور غلط فعل میں یہ مبتلا
ہیں، قوموں کو لوٹنے والے، ملکوں کو غلام بنانے والے، عرب اسرائیل کا واقعہ دیکھو، اس سے
بڑھ کر کوئی آنکھوں میں خاک جھونکنے اور زبردستی کرنے کی کوئی اور مثال مل سکتی ہے؟ اور یہ
قومیں سینکڑوں برس سے یہی کرتی آتی ہیں، پھر کیا بات ہے کہ وہ ترقی کر رہے ہیں؟ کیا بات
ہے کہ ان کی زبان سے جو نکلتا ہے، ساری دنیا اس کے سامنے سر جھکا دیتی ہے؟ کیا بات ہے
کہ ان کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے؟ یہ بات ہے کہ سائنسداں اور اہل کمال کے پیدا ہونے کا
سلسلہ وہاں ختم نہیں ہوتا؟ نہ امریکہ میں ایجادوں کا سلسلہ بند، نہ روس میں ایجادوں کا سلسلہ
ختم، روز افزوں ترقی ہے، اس سے ہمارے بعض ناواقف دوستوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کے
مقبول بندے ہیں، اس پر ایک صاحب نے کتاب بھی لکھی، ہمیں تو نہ ان کے بزرگوں کے
اعمال اچھے معلوم ہوتے ہیں، نہ ان کے اعمال پسندیدہ ہیں، ہم نے یورپ جا کر آنکھوں سے دیکھا
کہ کتنا شراب پیتے ہیں، بدمست رہتے ہیں، ظلم کرتے ہیں، اور کتنے خدا سے غافل ہیں، پھر

بھی ان کی ہر چیز ترقی کر رہی ہے اور ہماری ہر چیز مرجھا رہی ہے، سوکھ رہی ہے، ہماری اخلاقیات، سیاسیات، تعلیمات، سب روبہ زوال ہیں، ہمارے تمدن وتہذیب انحطاط پذیر، ہمارے کس شعبہ میں ترقی ہے؟ مصر، شام اور سعودی عرب کہیں بھی ترقی کا نام ونشان نہیں۔ کس چیز نے کس میدان میں ترقی کی؟

پہیلی بوجھو، اگر وقت ہوتا، ہم کہتے چار دن کی مہلت، مگر ہمیں تو خود ہی فرصت نہیں، ہم پہیلی بھی آپ کے سامنے رکھتے ہیں اور بوجھ کر بھی دیتے ہیں۔

محنت کا پھل ضرور ملے گا

بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ازلی ہے جو محنت کرے گا، جو کوشش کرے گا، جو بھی کسی چیز پر توجہ مرکوز کرے گا، ہم دے اس کا پھل ضرور دیں گے، اور یہ بھی نہیں فرمایا کہ وہ اچھی یا بری کوشش ہوگی، ہم اس کا پھل دیں گے، ببول کا درخت پھلے پھولے گا، کانٹے پیدا ہوں گے، سیب کا درخت سیب کے پھل دے گا، اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم سیب اگاتے ہو کہ ببول لگاتے ہو، ہمارا قانون یہ ہے کہ جس چیز کا درخت لگاؤ گے، زمین مدد کرے گی، بادلوں کو حکم ہے، پانی کو حکم ہے کہ وہ اس کی نشو ونما میں مدد کرے۔

یورپ آج کوشش کر رہا ہے، سائنس میں، علوم وفنون میں، سیاسی اور اقتصادی فلسفوں کو بنانے میں، پھیلانے میں، اور ان کا پرچار کرنے میں یورپ کوشش کر رہا ہے، نباتیات میں، حیاتیات میں، اقتصادیات میں، آج نہیں سینکڑوں برس پہلے ہماری جب کوشش تھی تو ہم نے تاریخ عالم پر اپنے انمٹ نقوش چھوڑے، شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ، مجدد الف ثانیؒ اور مشائخ چشت کے حالات پڑھو تو معارف وحقائق کے جو موتی ہیں، ان سے آدمی تکتے میں رہ جائے، کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ میں نے کتاب کھولی اور کہا کہ اب ہضم نہیں ہوتا، دماغ جواب دے دیتا ہے، انسان ایسے باریک نکتوں تک پہنچ سکتا ہے، ایسے نفس انسانی کی معرفت، ایسے معارف وحقائق، ایسے کمزوریوں کی پہچان، اللہ تعالیٰ کی یاد کی ایسی لذت، ایسا استغراق!!

یہ سب اس وجہ سے ہوا کہ ان حضرات نے اس پر پوری پوری توجہ مرکوز کی، اور ان کے لیے جو صلاحیتیں انھیں دی گئی تھیں، وہ استعمال ہوئیں۔ ہمارے جیسے انسان تھے مگر ان بلندیوں تک پہنچے، بزرگان دین کے اخلاقی واقعات کو پڑھیے تو ذہن کام نہیں کرتا۔

اخلاق کی بلندی کا ایک واقعہ سنیے۔ ایک مسافر ایک مسجد میں آیا، وہ اپنے ساتھ ایک تھیلی بھی لایا جیسے مسافروں کے پاس اس زمانہ میں ہوا کرتی تھی، اتفاق سے کسی نے اس کی تھیلی اڑا دی۔ اس مسجد میں یہ مسافر تھا اور ایک بزرگ تھے، تیسرا کوئی شخص نہیں تھا، اس کو یہ شبہ ہوا کہ یہاں یہ جو ان صاحب کے علاوہ کوئی نہیں، انھوں نے ہی چرائی ہے، بس آ کر دیکھتے ہی ان کو گرایا اور انھیں بے تحاشہ مارنے لگا، بہت زد و کوب کیا، اتنے میں لوگوں کو معلوم ہوا کہ بزرگ کے ساتھ یہ معاملہ کیا جا رہا ہے، یہ وہ شخص ہیں جو بڑے بزرگ تھے، لوگ دوڑے، اس کو پکڑ لیا اور اس مسافر پر ناراض ہونے لگے، اب اس مسافر کو محسوس ہوا کہ اس سے غلطی ہوئی، اور وہ اس بزرگ کے قدموں پر گر گیا اور کہا کہ حضرت مجھ سے بڑا قصور ہوا، مجھ سے شبہ میں آپ سے گستاخی ہو گئی، تو ان بزرگ نے جواب میں کہا کہ بھئی معافی مانگنے کا کیا سوال، جتنی دیر تم مجھے مارتے رہے میں دل سے یہ دعا کر رہا تھا کہ خدایا میں جنت میں اس وقت تک نہ جاؤں گا جب تک یہ بندہ جنت میں نہ جائے، تم مارتے جاتے تھے اور میں تمہارے لیے دعا میں مشغول تھا، ایسے صدہا واقعات آپ کو ملیں گے۔

کانٹوں کے ساتھ کانٹوں کا سلوک، کیا جس کو کاٹے پھر اس کا، حقیقت تو اللہ کے اولیاء کا مشہور مقولہ ہے کہ "ہم سیدھوں کے ساتھ سیدھے تھے اور ٹیڑھوں کے ساتھ بھی سیدھے تھے"۔

جس صنف میں تلاش کیجیے ہمارے بزرگوں کی بلندی کے نشانات ملیں گے، ان کی اخلاقی بلندی، عالی ظرفی، مکارم اخلاق، ان کے اخلاق کی باریکیاں اپنی مثال آپ ہیں۔

اب علم کے میدان میں دیکھیے، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا علم، ان کے واقعات پڑھ کر آدمی انھیں افسانہ سمجھتا ہے، امام بخاری کے حافظہ کی روایات دیکھیے جن کے حافظہ کی مثال نہیں ملتی، ان کے حافظہ کا مشہور واقعہ ہے جو بغداد میں پیش آیا، اور جن لوگوں نے کتابوں میں پڑھا

ہوگا، کتنے ہی آدمیوں نے حدیث کے متن وسند میں گنڈ غذ کر کے حدیثیں پڑھیں اور امام بخاریؒ نے ان سب کی تصحیح صرف اپنے حافظہ کی مدد سے کی۔ ''علمائے سلف'' یہ کتاب آپ پڑھیں تو ہمارے اسلاف کے علمی ذوق، ذہانت وقوت حافظہ کے سینکڑوں واقعات آپ کو ملیں گے۔ ابن جوزیؒ کی مجلس وعظ میں مختلف قسم کے سینکڑوں سوالات آتے، اور وہ ایک ایک پرچہ کے جواب شافی دیتے، یہ سب اس آیت کی تفسیر ہے کہ ﴿كُلًّا نُّمِدُّ هَٰؤُلَاءِ وَهَٰؤُلَاءِ﴾ [1] جو جو کچھ بھی اللہ سے مانگے گا، اللہ تعالیٰ اسے دے گا، بس مانگنے کی ہمت اور حوصلہ کا معاملہ ہے۔

اس امت نے جس میدان کو اختیار کیا، اس میں کمال حاصل کیا، میدان جہاد ہو یا گوشۂ علم وتحقیق، ہر جگہ انھوں نے امتیاز پیدا کیا، جہاد کی ہوا چلی تو ایسے واقعات ان سے رونما ہوئے کہ زندگی کا اتنا شوق نہیں رہا جتنا موت کا شوق غالب آ گیا۔

زہد وعبادت کا معاملہ لیجئے، بادشاہوں سے استغناء کا معاملہ لیجیے، ایک سے ایک بڑھ کر واقعہ آپ کو تاریخ میں ملے گا، علاء الدین خلجی نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے ملاقات کرنی چاہی، حضرت نے جواب فرمایا کہ میرے دو دروازے ہیں، بادشاہ ایک دروازے سے داخل ہوگا تو میں دوسرے دروازے سے نکل جاؤں گا۔ ابھی قریب کے زمانہ میں بھی ایسے مستغنی لوگ گزرے ہیں۔

علم وفن کے میدان میں اگر انھوں نے حدیث، تفسیر، فقہ کو اپنی محنت وجد وجہد کا مرکز وموضوع بنایا، تو ان علوم کو آسمان تک پہنچا دیا، دیکھ لو اپنے ندوہ کا کتب خانہ، دیکھو تفسیر میں کتنی کتابیں ہیں ہمارے علماء کی، حدیث میں تو اتنے تنوع وتفنن سے کام لیا ہے کہ جس کا اعتراف مستشرقین کو بھی ہے۔

پھر سیرت کو لیجیے، اس امت نے ان میدانوں کی طرف رخ کیا تو وہاں تک پہنچ گئے جہاں تک انسان کا ذہن نہیں پہنچتا، اور یورپ جب مادیات کے میدان میں کوشاں ہوا تو

---

(۱) سورۃ الاسراء: ۲۰

وہاں تک پہنچا کہ ہمارے آپ کے سمجھ میں آنے والی بات نہیں رہی۔

یہ مقبولیت اور نامقبولیت کا معاملہ نہیں، بلکہ محنت وجدوجہد اور توجہ و یکسوئی کا مسئلہ ہے، آج ہمارے مدارس سے امام غزالی اور امام رازی کیوں نہیں پیدا ہورہے ہیں؟ اللہ تعالیٰ اب بھی قادر ہے کہ اس سطح کے اہل کمال پیدا کرے۔

بات کروڑوں کی مت، بلکہ ایک صاحب کی تحقیق تو یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمان ۲۸ کروڑ ہیں، اتنی بڑی امت اور یہاں کی زندگی پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ رہا ہے! ہمارے بزرگ مقناطیس کی طرح مسلم اور غیر مسلموں کو اپنی طرف کھینچتے تھے، ابھی قریب زمانے میں مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کا نام لیا گیا، جن کے خلفاء اور متوسلین ہی کا قائم کردہ یہ دارالعلوم ندوۃ العلماء ہے، ان کی خدمت میں لفٹننٹ گورنر اور سر آسمان جاہ جیسے آرہے ہیں جو حیدرآباد کے میر نامراد تھے، ان کی آمد کے موقع پر کانپور سے ناوتک ایک مجمع لگا تھا، مگر حضرت کی خانقاہ میں اس کا کوئی ذکر اور آمد کی اہمیت نہیں تھی، یہ سب ابھی ہم نے دیکھے، ان لوگوں نے آخرت کو، اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور کبریائی کو اپنے سامنے رکھا، اور اس میدان میں محنت وجدوجہد کیا تو اس مقام تک پہنچے۔

اب کیوں ایسے ممتاز افراد علم، روحانیت اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں نہیں پیدا ہورہے ہیں، جب کہ یہ دین ابدی اور یہ آخری امت ہے؟

صرف یہ وجہ ہے کہ ہم کو آپ کو شوق نہیں رہا، ہماری ہمتیں اور کوششیں چھوٹی چھوٹی حقیر چیزوں تک صرف ہورہی ہیں، ہمارے تعلیمی نظام میں بڑا انحطاط ہوگیا، آج ہندوستان میں لاکھوں مدارس دین کے طالب علم ہیں، مگر کوئی بیرونی اور عبقری پیدا نہیں ہورہا ہے، اس کا قصور صرف ہمارا ہے کہ ہماری ہمتیں بلند نہیں، ہم اللہ سے مانگتے نہیں، ہم کوشش نہیں کرتے، اگر تم کوشش وجدوجہد کروگے تو تمہارے اندر بھی مقابلے اور مسابقت کا وہی جذبہ پیدا ہوگا جیسا کہ یورپ میں آج ہے۔

یورپ میں ہزاروں افراد، علمی ادارے، یونیورسٹیاں جدوجہد میں لگی ہیں، جرمن قوم کو

انھوں نے اپنے یہاں تجربہ کیا اپنی صلاحیتوں کو دیانت داری اور سنجیدگی کے ساتھ استعمال کرنے اور ان کے نتائج کو دیکھنے کا۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے اور تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اور ایک ایسے انسان کی حیثیت سے جو اپنی قسمت کو عالم اسلام اور پھر عالم عربی سے وابستہ سمجھتا ہے، اور جس کے انجام پر اور جس کی عزت پر اور ذلت پر اس کے اعتماد اور بے اعتمادی پر واقعات کا گہرا اثر پڑتا ہے، میرے لیے اس سفر میں بہت بڑے مطالعہ و غور وفکر کا سامان تھا، اور اس سے بہت اہم نتائج نکالے جا سکتے تھے، پھر حج کا متبرک زمانہ بھی اسی قیام کے زمانے میں آ گیا اور اس کی برکت سے عالم اسلام کی بڑی اہم شخصیتوں اور خاص طور پر شرق وسطی اور پڑوسی ممالک مصر و شام کے بہت سے اہم اشخاص سے ملنے کا اتفاق ہوا، معلومات میں اضافہ ہوا، نئے نقطۂ نظر سامنے آئے، بعض نئے حقائق بھی سامنے آئے، اور سب کا تقاضا ہے کہ میں ان میں سے کسی پہلو کے متعلق اظہار خیال کروں، اور آپ کو جو آپ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکے ہیں اور آپ کے لیے دیکھنا بھی آپ کی اس مصروف زندگی میں مشکل ہے، میں ان حقیقتوں کو آپ کے سامنے لاؤں، آپ کا مجھ پر حق بھی ہے اور آپ سے بڑھ کر اس سے زیادہ کوئی موزوں اور مناسب مجمع نہیں ہو سکتا۔

اندرونی درد باہر کی دنیا میں

لیکن ہم ان ساری چیزوں سے جس کو کہتے ہیں کہ آدمی چوٹ کھایا ہوا ہوتا ہے، یا کسی حقیقت کا غلبہ ہوتا ہے، تو اس کو ہر واقعے میں ہر منظر میں اپنی کام کی چیز نظر آتی ہے، اور وہ اپنے اندرونی درد کو باہر کی دنیا میں دیکھتا ہے۔ ایک عرب شاعر کو جو اپنے بھائی کے فراق کا داغ اٹھا چکا تھا، اور اس پر اس کا قلق اور اس کا صدمہ پورے طور پر غالب تھا، لوگوں نے اس پر ملامت کی کہ وہ ہر قبر کے پاس ٹھہرتا ہے اور وہاں بیٹھ کر آنسو بہاتا ہے، لوگوں نے کہا کہ یہ سلسلہ تو بڑا دراز ہے، اور ہر قبر کا یہ حق کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ غمزدہ آدمی اس کے پاس ٹھہرے اور اپنے پرانے زخموں کو یاد کرے، اور اپنا غم تازہ کرے، تو اس نے کہا:

سے بڑی حقیقت روٹی تھی، تو عہد کا مصداق اس کے نزدیک اس حقیقت سے زیادہ کوئی نہیں تھا کہ جو اس کے ذہن ودماغ پر مستولی اور اس کے دل کی گہرائیوں میں پیوست تھی، تو مجھے ان سارے واقعات میں خواہ سیاسی ہوں، تمدنی ہوں، خواہ علمی وفکری ہوں، سب میں اس زوال کی پرچھائیاں نہیں بلکہ اس زوال کا چہرہ نظر آیا، تابناک چہرہ، بالکل درخشاں چہرہ نظر آیا، اور ہر واقعہ سے مجھے یہ پیام ملا کہ اس وقت عالم اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ ان انسانوں کا فقدان ہے جو طاقتور ایمان رکھتے ہوں، جو یقین کی دولت سے مالا مال ہوں، اور جن کے اندر دینی استقامت ہو، اور جن کی نگاہ بلند ہو، جن کا سخن دلنواز ہو، اور جان پرسوز ہو۔

جاں باز ملاح مفقود

یہ عالم اسلام کی اس وقت سب سے بڑی حقیقت ہے، اور یہ حقیقت جو شخص اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھے، پھر وہ اپنے دماغ اور آنکھوں کو دھوکہ نہیں دے سکتا، اس سے آپ کچھ بھی کہلوا لیجیے، کوئی بھی موضوع ہو، کہیں سے واپس آیا ہو، بیت اللہ کے طواف سے واپس آیا ہو، یا مسجد نبوی کی زیارت سے واپس آیا ہو، علماء کی کسی مجلس سے واپس آیا ہو، یا کسی سیاسی موتمر سے واپس آیا ہو، اس نے اخبار پڑھا ہو، یا تاریخ کی کوئی کتاب پڑھی ہو، یا کوئی داستان پڑھی ہو، یا کوئی ادبی شاہکار پڑھا ہو، اس پر یہ حقیقت پورے طور پر غالب رہے گی، جب بولے گا تو اسی کی زبان سے، اور جب دیکھے گا تو اسی کی آنکھ سے، اس وقت پورے عالم اسلام کا مسئلہ یہ ہے کہ قیادت تو بڑی چیز ہے، موجودہ حالات سے آنکھیں ملانے والے۔ موجودہ حالات کے چیلنج کو قبول کرنے والے، اور اس دھارے کے خلاف چلنے والے، یا کشتی چلانے والے تو بڑی چیز ہے، ہاتھ پیر مارنے والے بھی ناپید ہیں، ایسے جانباز ملاح آج عالم اسلام میں مفقود ہیں، جیسے کسی زمانے میں لوگ عنقا کی مثال دیا کرتے تھے، پتہ نہیں اس کی کیا حقیقت ہے؟ اس کا کہیں وجود ہے یا نہیں؟ لغت میں لکھا ہے: معروف الاسم مجہول الجسم، اس سے بہتر اس کی تعریف نہیں ہو سکتی، لیکن آج کا سب سے بڑا خلا جو ہے وہ وہ مسلمان ہیں جو ان حالات سے شکست نہ کھائیں، شکست ماننے کے لیے تیار نہ ہوں، اور وہ "آہنگ

نے فتح کر لیا۔ اور اس لیے فتح کیا کہ اس قلعے میں قطعاً کوئی کمزوری نہیں، اس قلعے کی دیواریں آہنی، اس قلعے میں وہی ہتھیار، ہی موجود جو پہلے تھے بلکہ اس سے زیادہ، لیکن صرف یہ کہ وہ غیور مسلمان نہیں رہا، وہ اس کا پاسبان نہیں رہا، وہ صفات و اخلاق اور وہ علم صحیح اور سیرت میں پختگی و کردار کی مضبوطی اور استقامت نہیں رہی، تو مجھے سب جگہ، میں زیادہ واضح الفاظ میں کہوں، مجھے سب جگہ ندوہ نظر آیا۔ مجھے سب جگہ ہندوستان نظر آیا۔

مسئلہ یہ ہے کہ آدمی نہیں

کوئی مسئلہ نہیں عالم اسلام میں، نہ پاکستان کا کوئی مسئلہ ہے، نہ مصر کا کوئی مسئلہ ہے، نہ شام کا کوئی مسئلہ ہے، نہ سعودی عرب کا کوئی مسئلہ ہے، نہ سوڈان کا کوئی مسئلہ ہے، نہ ہندوستان کا کوئی مسئلہ ہے، نہ کوئی مشکل (Problem) ہے، نہ کوئی ایسا معمہ ہے، نہ کوئی ایسی گتھی ہے، نہ کوئی چیستاں ہے، نہ کوئی ایسے ذہانت کا امتحان ہے، کچھ نہیں، سارا مسئلہ یہ ہے کہ آدمی نہیں، آدمی کیوں نہیں کہ آدمیت کی جو کارگاہیں ہیں، جو انسانیت کے کارخانے ہیں، جہاں آدم گری اور مردم سازی کا کام ہوتا ہے، یا زیادہ صحیح الفاظ میں ہونا چاہیے، وہ کارگاہیں اس وقت معطل پڑی ہیں، یا وہ کارگاہیں چل رہی ہیں مگر آدمی تیار نہیں ہو رہا ہے، مجھے تو اپنے پہلے اور دوسرے سفر میں بھی ندوہ اور دیوبند ہی نظر آئے، اس میں کوئی مبالغہ نہیں اور کوئی خوشامد اور خود فریبی بھی نہیں ہے، میں تو اپنے نفس کو خوش کرنا چاہتا ہوں بلکہ بالکل جیسے متمم بن نویرہ نے کہا تھا:

فـــدعـنـي فهــذ ا كُــلُّـــه قبــرُ مـــالِكٍ

زندہ انسانوں کے مقبرے

مجھے زندہ انسانوں کے مقبرے نظر آئے، وہ تو مردہ بھائی پر روتا تھا، میں زندہ انسانوں پر روتا ہوں، کون زیادہ بدقسمت اور قابلِ رحم ہے، میں نہیں کہہ سکتا، شاعر ایک ایسی ہستی کو روتا تھا جس کے لیے موت مقدر تھی، اور اس کو اس دنیا سے جانا تھا اور اس کا وقت موعود آ چکا تھا،

لیکن میں تو ان زندہ انسانوں پر روتا ہوں جن کو زندہ رکھنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے، جو دوسروں کو زندہ کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے، جس کے حصہ میں مسیحائی آئی تھی، جن کے حصہ میں دنیا کو حیات و موت کا پیغام دینا تھا، جن کو ساری دنیا کی ظلمت سے مقابلہ کرنا تھا، میں تو ان کے لیے روتا ہوں۔

میں اس فانی انسان کا مرثیہ خواں نہیں، میں تو ملت کا مرثیہ خواں ہوں۔ میں ان کارگاہوں کا مرثیہ خواں ہوں جن کا کام ہی یہ تھا، اگر ان کا کوئی جواز تھا، اگر ان کی کوئی افادیت تھی، اگر کوئی ان کی قدر و قیمت تھی، تو یہ کہ وہ ایسے آدمیوں کو پیدا کرے اور عالم اسلام کو زوال سے بچائے، مصر کا کیا مسئلہ ہے؟ مصر کا مسئلہ یہ ہے کہ قائد نہیں، مصر کا مسئلہ یہ ہے کہ ایک حسن البنا کے بعد دوسرا حسن البنا نہیں پیدا کر سکا، مصر کا مسئلہ یہ ہے کہ اس نے ایک ایسا آدمی (جمال عبد الناصر) پیدا کیا جس نے سارے عربوں بلکہ سارے مسلمانوں کے دلوں پر سیاہی پھیر دی اور سب کو ذلیل کر کے رکھ دیا، سارا کھیل آدمی کا ہے۔

آدمی ہے تو سب کچھ ہے

جہاں آپ جائیے گا، آپ تاریخ کے جس دور کا مطالعہ کیجیے گا، آپ کو معلوم ہوگا تاریخ کتنی پھیلی ہوئی ہے، وہ اتنی حد تک سمٹی ہوئی ہے، تاریخ کا رقبہ کتنا ہی وسیع ہو، وہ ایک ضخیم جلد ایک دور کی تاریخ کو لیجیے، پوری تاریخ تو بڑی چیز ہے، کہنے کو تو ذرا سی باتیں ہیں، لیکن پھیلا یئے تو داستاں، لیکن سمیٹے تو ایک نکتہ، پھیلا یئے تو ملت کی تاریخ، پھیلا یئے تو حوادث و تغیرات کی تاریخ اور اس کی تفسیر، اور سمیٹے تو ایک انسان کے کام کی کہانی، صرف یہ ہے کہ وہ انسان ہے یا نہیں، اگر وہ انسان ہے تو ملت ہے، قسمت ہے، عزت ہے، اگر انسان ہے تو بالکل تاریخ کی شکل ہی دوسری، اگر انسان نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ وہی عالم اسلام تھا جو صلیبیوں سے شکست کھاتا چلا جا رہا تھا، اور بڑھتے بڑھتے اندیشہ تھا کہ حرمین کے حدود تک نہ پہنچ جائے، لیکن ایک شخص نور الدین زنگی نام کا پیدا ہوتا ہے، اور فوراً اس کے پیدا ہوتے ہی حالات میں

تغیر ہونا شروع ہو جاتا ہے، پھر اس کے بعد ایک دوسرا شخص پیدا ہوتا ہے صلاح الدین ایوبی، جو واقعات کے دھارے کو بدل دیتا ہے، تاریخ کے رخ کو بدل دیتا ہے، زمانے کی کلائی موڑ نہیں بلکہ توڑ دیتا ہے، زمانہ کی کلائی، تاریخ کی کلائی، ان صلیبی فاتحوں کی کلائی اس نے موڑی نہیں بلکہ توڑ دی، سب آدمی کا کرشمہ ہے، آدمی ہے تو سب کچھ ہے۔

عالم اسلام کی سب سے بڑی کمزوری

آج اس وقت عالم اسلام کی سب سے بڑی کمزوری ہے کہ وہ نوجوان نہیں پیدا ہو رہے ہیں کہ جن کے اندر ایمان ہو، جن کے اندر کیرکٹر ہو، جن کے اندر یقین ہو، جن کے اندر درد ہو، جن کے دل کی کلی کھلی ہوئی ہو، جیسے کہ یہاں میں نے بعض تقریروں میں کہا، دل کی کلی کھلی ہوئی ہو، دل پر چوٹ لگی نہیں، کوئی درد کی چوٹ لگی نہیں، پورے قلب و جگر کو دیکھ لیجیے، کوئی ایکسرے کے ذریعے جو خاص قسم کا معنوی ایکسرے ہو، آپ اس سے پورے جسم کے اندر واتر کر دیکھ لیجیے، کوئی درد و زخم کا نام و نشان نہیں، زبان قینچی کی طرح چلنے والی، ایسے ایسے خطیب، ایسے ایسے آرٹسٹ، ایسے ایسے صاحب فن، ایسے ایسے سیاست داں، ایسے ایسے ذہین لوگ موجود ہیں جن کے سامنے پرانی نسل کے لوگ آتے ہوئے شرمائیں، لیکن ایک مسئلہ حل نہیں ہو رہا ہے، برابر مسئلہ الجھتا ہی چلا جارہا ہے، پاکستان کا کیا مسئلہ ہے؟ پاکستان کا مسئلہ یہ ہے کہ ملک ہے اور قائد نہیں، قوم ہے اور لیڈر نہیں، ریوڑ ہے اور ان کا کوئی چرواہا نہیں، اسی طریقے سے آپ سارے ملکوں کا حال دیکھ لیجیے، خود ہمارے ملک ہندوستان کا مسئلہ کیا ہے؟ کہ وہ لوگ نہیں، کیوں نہیں؟ جہاں لوگ پیدا ہونے چاہئیں، جو کارگاہیں ہیں، وہاں آدمی نہیں بن رہے ہیں، کیوں آدمی نہیں بن رہے ہیں؟ کس چیز کی کمی ہے؟ ایک ایک چیز کو آپ سامنے لیجیے، میں کوئی پہیلی بجھانا نہیں چاہتا، کون سی چیز ہے جو دنیا سے اٹھ گئی ہے؟ کیا قرآن شریف میں۔ نعوذ باللہ۔ کوئی تحریف ہو گئی؟ کیا حدیث شریف کے درس کا سلسلہ رک گیا؟ کیا فقہ کی کتابیں۔ نعوذ باللہ۔ ناپید ہو گئیں؟ اصول فقہ کے کتابی ذخیرے کو آگ لگ گئی؟ کوئی نیا تاتاری حملہ ہوا یا کوئی سیلاب آیا؟ کوئی چیز نہیں، وہی کتب خانے ہیں، وہی کتابیں ہیں، وہی

بڑھتے بڑھانے کا سلسلہ ہے، وہی خاندان ہیں، ان کے چشم و چراغ ہیں، اور وہی قال اللہ و قال الرسول کی صدائیں ہیں، لیکن بات یہ ہے کہ پنجہ مارنے والے، جان کی بازی لگانے والے، یہ فیصلہ کرنے والے کہ ہم دنیا ہیں، ہم ہیں اسلام، ہم ملت اسلامیہ ہیں، ہم اسلام کی قسمت ہیں، ہم اچھے ہیں تو عالم اسلام اچھا ہے، ہم اگر مضبوط ہیں تو عالم اسلام مضبوط ہو، عزم ایسا عزم راسخ، پھر آدمی کو اس کے بعد اس کی جگہ سے کوئی چیز ہٹا نہ سکے، ہزاروں طوفان اٹھیں، ہزاروں آندھیاں چلیں، ہزاروں سیلاب آ گئے، نوجوانی کی آزمائشیں بھی، ماحول کی خرابیاں بھی، بدترین دعوتیں اور تحریکیں بھی، مختلف ترغیبات، اندرونی و بیرونی ہر طرح کی ترغیبات، انتخابات بھی، حکومتوں کی تشکیل بھی اور تخت و تاج بھی، تخت و تاج کا زمانہ تو نہیں رہا، لیکن جاہ و منصب بھی، لیکن کچھ نوجوان یہ طے کرلیں کہ ہم اپنے کو ہٹائیں گے۔ ہم ہیں سب کچھ! میں بار بار کہتا ہوں، لیکن مجھے اس سے بڑھ کر بہتر شعر نہیں ملا کہ ؎

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

کوئی من میں ڈوبنے والا، کوئی دینے کو پکڑ کر بیٹھ جانے والا، کوئی یہ کہنے والا کہ مجھ سے بڑھ کر کوئی چیز قیمتی نہیں ہے، میں اگر تیار ہو گیا، اپنے کو بنا لیا تو یہ کشتی جو جھکولے کھا رہی ہے، اور معلوم ہو رہا ہے کہ اب ڈوبی تب ڈوبی، یہ کشتی کنارے لگ جائے، یہ فرق ہے آج کے زمانے اور پہلے کے زمانے میں کہ کسی نہ کسی تعداد میں۔ تعداد کا فرق تو برابر رہتا رہا، لیکن پہلے تھوڑی تعداد میں، اس کے بعد بڑی تعداد میں، بہرحال ہر دور میں کچھ ایسے لوگ ملتے ہیں جنھوں نے سر سے کفن باندھ لیا، کسی نہ کسی تعداد میں ایسے لوگ ملتے رہے جنھوں نے طے کر لیا کہ ہم اپنے کو بنائیں گے، اور ہم کسی چیز کا اثر نہیں قبول کریں گے، ہم ایک چٹان ہیں، ایک پتھر کی چٹان جو جنبش نہیں کرسکتی، سیلاب آئے ٹکرا کر چلا جائے اور پار کر کے چلا جائے، لیکن ہمارے اندر جنبش نہیں ہوگی، ساری تاریخ اسلام بلکہ تاریخ انسانیت آدمی کی ممنون ہے، آدمی اگر پیدا ہو رہے ہیں، اگر ایسے صاحب عزم لوگ جو اپنے متعلق طے کرلیں کہ ہمیں کسی چیز سے متاثر نہیں ہونا ہے، ہم تو اپنے دھن کے پکے ہیں، بس جان چلی جائے اس راستہ میں یا

ہم کچھ کر کے اٹھیں گے، کچھ بن کر کے نکلیں گے، اور ہم کچھ ہو جائیں گے، صاحب دعوت ہو جائیں گے، صاحب ایمان ہو جائیں گے، یہ عزم تھا جو ہمیشہ مسلمانوں کی دستگیری کرتا رہا، حوادث سے کوئی زمانہ خالی نہیں، کبھی نہ سوچیے کہ یہ زمانہ بہت پر آشوب ہے، جس زمانے کا حال دیکھیے، تاریخ میں دیکھیے، دیوان دیکھیے شعراء کے، شعراء نے اپنے زمانہ کا کیسا شکوہ کیا ہے، گویا اس سے بڑھ کر کوئی برا زمانہ تھا ہی نہیں، یہ صحیح ہے کہ کوئی زمانہ فتنوں سے خالی نہیں رہا، کوئی زمانہ آزمائشوں سے خالی نہیں رہا، لیکن ہر زمانے اور ہر دور میں ایسے لوگ موجود رہے، جنھوں نے سر سے کفن باندھ لیا اور انھوں نے کہا، ہمیں تو کسی چیز سے مطلب نہیں، ہم تو اپنے آپ کو بنائیں گے، اپنی سیرت کی تعمیر کریں گے، ہم تو خدا کے رسول کا بتایا ہوا راستہ اختیار کریں گے، نہ دائیں طرف دیکھیں گے اور نہ بائیں طرف دیکھیں گے، انہیں میں کوئی غزالی پیدا ہوا، کوئی ابن تیمیہؒ پیدا ہوا، کوئی مجدد الف ثانی پیدا ہوا، کوئی صلاح الدین ایوبی پیدا ہوا، کوئی شاہ ولی اللہؒ پیدا ہوا، کوئی ابوالحسن اشعریؒ پیدا ہوا، کوئی طارقؒ پیدا ہوا، یہ سب وہی لوگ تھے جنھوں نے طے کر لیا کہ ہمیں راستہ اختیار کرنا ہے، ہمارے لیے تقدیر الٰہی نے یہ راستہ اختیار کر دیا ہے، ہم نے یہ راستہ اختیار کیا ہے، یا اللہ نے ہمیں اس کی توفیق دی، ہمیں اس راستے پر چلنا ہے مضبوطی کے ساتھ، اور ہر طرح کی قربانی، ہر طرح کا مجاہدہ، ہر طرح کی آزمائش ہمیں منظور ہے، اس کو قبول کریں گے، لیکن ہم اس راستہ کو نہیں چھوڑیں گے، جو نتیجہ آپ دیکھتے ہیں، وقتاً فوقتاً کچھ کرنیں نظر آتی ہیں، کچھ چراغ جلتے ہیں، اور ان چراغ سے دوسرے چراغ جلتے ہیں، اور عالم اسلام میں ایک نئی توانائی اور ایک نئی درخشانی پیدا ہو جاتی ہے، وہ سب اسی عزم و حوصلہ کا نتیجہ ہے۔

عزم و حوصلہ اور استقامت

ہمارا فرض یہی ہے کہ ہم اپنے کو بنائیں، اپنی سیرت کی تعمیر کریں، پھر اللہ تعالیٰ نے جو کچھ ہمیں صلاحیت عطا فرمائی، ان صلاحیتوں کے ساتھ اس دین کی خدمت کریں اور سب کی خدمت کریں، آخرت کی نجات کا سامان پیدا کریں، مسلمانوں کی خدمت کی کوشش کریں،

تو ز، مگر اصل چیز مطالعہ ہے۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ہمارے عزیز طلبہ نے جو کچھ یہاں پڑھا، ان میں ان کے مطالعہ کی خوب جھلک نظر آتی ہے، کہنے کی ایک بات یہ ہے کہ آپ جس قدر پڑھیں گے اسی قدر آپ کا ذہن ترقی کرے گا۔

دنیا میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں، ایک وہ جنھیں علم لدنی حاصل ہوتا ہے، ایسے لوگ بہت نایاب ہوتے ہیں، دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو اپنے علم و مطالعہ کے راستے سے کوئی انقلاب لاتے ہیں اور کوئی انقلابی کام کرتے ہیں۔ (۱)

---

(۱) دارالعلوم ندوۃ العلماء میں جمعیۃ الاصلاح کے ایک پروگرام میں کی گئی مختصر تقریر، ماخوذ از "تعمیر حیات" لکھنؤ (شمارہ ۱۰، ۱۰ ستمبر ۔ ۲۰ ۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۲ء)۔

پوزیشن میں، اور ڈاکٹر احمد امین سے میری جو باتیں ہوئیں وہ آپ مذکرات سائح فی الشرق العربی میں پڑھیں، تو ایک آدمی جو تیرا آدمی جس کی ساری عمر گویا بھی گزار ہے، ہندوستان میں اس نے پڑھا ہے، وہ نابغۂ شرق عربیا سے ملا ہے، آپ دیکھیں کہ ان کا جو مقام تھا وہ تھا، لیکن اگر میں ان سے دو سوال کرتا تھا تو ایک سوال وہ مجھ سے بھی کرتے تھے، کچھ چیزیں ایسی تھیں جو وہ مجھ سے پوچھتے تھے، اور بہت زیادہ چیزیں ایسی تھیں جن میں میں ان سے استفادہ کرتا تھا، لیکن ایسا نہیں تھا جیسے کوئی شاگرد رشید یا کوئی کو دم کسی مُلاق کے پاس بیٹھا جائے، یہ صورت نہیں تھی۔

اپنی درسگاہ پر فخر

یہ کس بات کا نتیجہ تھا؟ یہ یہاں کی تعلیم کا نتیجہ تھا جو خود اعتمادی پیدا کرتی تھی، ہمارے دار العلوم میں اور کچھ ہوتا ہو لیکن اس زمانہ میں الحمدللہ دار العلوم میں ایک بہت بڑی چیز تھی، جو ذرا کم ہو رہی ہے اور اس کی حفاظت کی ضرورت ہے، وہ ہے اپنی درس گاہ پر فخر، اپنے اساتذہ پر، اپنے اسلاف پر فخر، وہ فخر نہیں جس میں دوسروں کی حق تلفی ہو، عصبیت ہو، بلکہ یہ کہ ان کا ایک مقام تھا، انھوں نے جو فکر دیا ہے، وہ فکر بہت آگے کا ہے، اب بھی بہت سے ممالک وہاں تک نہیں پہنچے، یا جس کو انگریزی میں سنس آف پرائڈ (Sense of Pride) کہتے ہیں، یعنی اپنی درسگاہ پر ناز، یہ بات تھی، اور میں الحمدللہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کے علاوہ بھی گھر کی صحبت نصیب فرمائی، اور خاص طور پر میرے بڑے بھائی صاحب مرحوم ان کی صحبت میں بیٹھ کر ایسا ذہن بن گیا تھا کہ کسی بڑے سے بڑے آدمی کے سامنے آنکھ جھپکتی نہیں تھی، اس لیے کہ وہ جدید تعلیم کے بھی اعلیٰ نمونہ تھے، اور قدیم تعلیم میں بھی بہت راسخ، یعنی یہ سمجھئے کہ میں نے ان سے عربی بھی پڑھی ہے، میں نے ان سے مجموعہ رحمۃ النصم و النثر کا بھی کچھ حصہ پڑھا ہے، میں نے دیکھا کہ ان کی صرف ونحو کی استعداد اتنی پختہ تھی اور عربیت ان کی اتنی اچھی تھی کہ میں نے کم آدمیوں کی دیکھی ہے، وہ اطمینان سے وہ مجھے ادب کی چیزیں پڑھاتے تھے، اور اخبار دیکھنا تو میں نے انھیں سے سیکھا، میں اس وقت خلیل عرب صاحب سے نفحۃ الیمن، البلاغۃ اور مقامات حریری وغیرہ پڑھ چکا تھا، اور میں نے جو عربی

اخبارات دیکھنا شروع کیے تو معلوم ہوئے کسی دوسری زبان میں ہیں، اس لیے کہ اس میں جو تعبیرات تھیں، وہ بالکل میرے لیے نامانوس تھیں، تو بھائی صاحب سے میں سمجھتا تھا کہ اس کا کیا مطلب ہے، تو میں نے اخبار بھی پڑھنا انھیں سے سیکھا، پھر میں نے انگریزی بھی ان سے پڑھی، تو ہر چیز میں ان کی استعداد تھی، ان کا مزاج ہی ایسا تھا کہ جو چیز تھی پختہ تھی، دوسرا یہ اتنا اطمینان تھا خاص طور پر اسلام پر، اسلام تو ایک بہت وسیع چیز ہے، شریعت اسلامی اور اسلامی تہذیب اور اسلاف پر اتنا اعتماد تھا کہ میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھا ہے، اللہ تعالیٰ نے ہمارے اسلاف کو، امت کے اسلاف کو جو چیز عطا فرمائی، جو گہرائی اور جو پختگی اور جو بصیرت ہے، وہ اب ہم میں کسی کے پاس نہیں ہے، اور پھر جس طرح وہ مغربی افکار پر تبصرہ کرتے تھے اور مغربی تہذیب پر متوازن اور گہری رائے دیتے تھے، اس کی وجہ سے میرے اندر وہ مرعوبیت ختم ہوگئی اور بڑے سے بڑے آدمی کے پاس جا کر میں مرعوب نہیں ہوا، یعنی مصر کے چوٹی کے لوگوں سے ملا ہوں کہ جن کی تحریریں یہاں پڑھتا تھا اور جھومتا تھا، ان سے ملا ہوں۔

نہ کوئی جامعہ کسی کو ادیب بناتا ہے اور نہ کوئی ماحول

جہاں تک عربی زبان وادب کا تعلق ہے، اس تعلق سے کہتا ہوں کہ سب دھوکہ ہے، نہ کوئی جامعہ کسی کو ادیب بناتا ہے اور نہ کوئی ماحول بناتا ہے، اور نہ کہیں کسی عرب ملک میں جانے سے عربی، یا کسی یورپین ملک میں جانے سے انگریزی آتی ہے، میں نے قاہرہ میں ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو بارہ بارہ، چودہ چودہ، سولہ سولہ برس سے تھے اور ان کی اس وقت تک عربی صحیح نہیں تھی، چند لکھتے تھے تو اس میں نحوی غلطی کرتے تھے، بعض فضلاء گئے اور وہاں پڑھنا شروع کیا اور وہ وہاں سے جب چند لکھتے تو اس میں نہیں تو تین غلطیاں پکڑ لیتا تھا، مضاف مضاف الیہ اور صفت موصوف کی غلطیاں ہوتی تھیں اور باقی جو لوگ وہاں تھے وہ مادری جیسی بولتے ہوں لیکن ان کو عربی نہیں آتی، تو وہ جو پرانا شعر ہے ذرا سا بے ادبی کر

خر عیسیٰ اگر بمکہ رود

چوں بیاید ہنوز خر باشد

عربی نے۔ کہاں ہو؟ اور میں بتادوں ان کا نام کہ جنھوں نے جو کچھ سیکھا پڑھا یہیں، وہ خدا کے فضل سے علمائے عرب، ادبائے عرب بھی ان کی کتابیں پڑھتے ہیں، اور اعتراف کرتے ہیں، یہی یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سب اپنی محنت اپنی کرنا اپنا بھرنا ہے، وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمین۔ (۱)

---

(۱) ۱۹۸۰ء میں مولانا محمد ناظم ندوی سابق شیخ الجامعہ جامعہ عباسیہ (بہاولپور) کی ندوہ آمد پر ان کے استقبال میں منعقدہ ایک جلسہ میں ان کے تعارف وخیر مقدم کے طور پر کی گئی تقریر سے ماخوذ، ماخوذ از تعمیر حیات، لکھنؤ، ۲۵ اگست ۱۹۸۰ء)۔

فیصلہ تیرا تیرے ہاتھوں میں ہے.......

فیصلہ کن دن

میرے عزیزو! آپ لوگ یہاں پر اس لیے جمع ہوئے ہیں کہ آپ کے اندر اس بات کا احساس و شعور پیدا ہو کہ آپ یہاں کیوں آئے؟ اور تعلیمی سال کے شروع ہونے کا کیا مطلب ہے؟ اور آپ کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟ اور یہاں کے قیام میں کیا فوائد ہیں؟ جس وقت اس پر توجہ نہ کی جائے اور آنے کے مقصد پر توجہ نہ دی جائے تو کیا خطرات ہیں اور کیا نقصانات ہیں؟ اس لحاظ سے یہ دن آپ کی زندگی کا بہت اہم دن ہے، اگر آپ سامنے کی چیز تو دیکھ سکتے ہیں لیکن دور کی نہیں دیکھتے لیکن اگر اللہ تعالیٰ بصارت کی نہیں بصیرت کی آنکھ کھول دیں تو آپ دور کی چیز بھی دیکھ سکتے ہیں، کاتب تقدیر اعمال نامہ لیے کھڑے ہیں اور منتظر ہیں آپ کے چہرے پر ان کی نظر نہیں ہے بلکہ آپ کے دلوں پر اور دلوں کے ارادوں پر ان کی نظر ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ایسی نظر دیتا ہے جس سے وہ اندر کی چیز بھی دیکھ سکتے ہیں، کاتب تقدیر آپ کے دلوں کو پڑھ رہے ہیں، آپ کے دماغ کی صفحوں کو دیکھ رہے ہیں، اور انتظار میں ہیں کہ وہ دیکھیں کہ آپ کے اندر کیا ارادہ ہے، عزم پیدا ہوا اور اس کو محفوظ تقدیر میں لکھیں، تو یہ آپ کی زندگی کا بہت اہم اور نازک دن ہے، فیصلہ کن دن ہے، اور ایک طرح سے گویا آپ کی معنوی پیدائش کا دن ہے، انسان کی پیدائش طبعی طور پر ایک دفعہ ہوتی ہے، لیکن اس کے بعد پیدائش کا سلسلہ جاری رہتا ہے، پیدا ہونے کے بعد بھی لوگ مرجاتے ہیں، اور پھر زندہ ہوتے ہیں، پھر مرتے ہیں پھر زندہ ہوتے ہیں، اور یہ سلسلہ

بعض وقت انسان کی اس دنیا سے جدائی کے وقت تک جاری رہتا ہے جیسے کہ سورۃ میں ہے ﴿اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا﴾[1]

سارا انحصار تمہارے فیصلہ پر ہے

میرے عزیزو! معلوم نہیں اس وقت کتنے لوگوں کی نئی عمر شروع ہو رہی ہے، آپ میں سے بہت بڑی تعداد تو نئی ہوگی، پرانے طالب علم کم آئے ہیں لیکن ایک تعداد ان طلبہ کی ہوگی جو دو سال، تین سال، چار سال اور بعض چھ چھ سات سات سال سے پڑھ رہے ہیں، لیکن بڑی تعداد ان کی ہے جو اسی سال آئے ہیں اور ابھی کسی کو آئے دو دن ہوئے ہیں، کسی کو چار دن ہوئے ہیں، ان دونوں کی میں یہ بات مخاطب ہیں کہ تمہاری عمر اب شروع ہو رہی ہے اور کاتب تقدیر تمہارے متعلق لکھنے والا ہے، اور تمہارے فیصلہ کا منتظر ہے، تمہاری قسمت کو دیکھ رہا ہے کہ تم نے اپنے بارے میں اگر صحیح فیصلہ کر لیا، اور اللہ نے تمہیں توفیق دی، اور تم کو چاہنے والی ماؤں کی گودوں نے تم کو رخصت کیا، اور تمہارے والدین کی دعائیں اگر اللہ کے یہاں قبول ہو گئیں، اگر تمہارے بزرگوں کے نیک اعمال جو کبھی انھوں نے کیے تھے، ان میں سے کسی نے بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کو کھینچا، تو پھر تمہاری صحیح عمر آج سے شروع ہو رہی ہے، اور تم اس وقت گویا دنیا میں قدم رکھ رہے ہو، حقیقی زندگی میں قدم رکھ رہے ہو اور یہ بہت کچھ تمہارے اختیار میں ہے۔

میں کہتا ہوں ساری دنیا کی سلطنتیں، ساری دنیا کے ادارے، ساری دنیا کے باشعور، تمہارے سارے خیر خواہ، تمہاری پیٹھ ٹھونکنے والے اگر یہ چاہیں کہ تم کام کے آدمی بن جاؤ، تم پڑھ لکھ کر آدمی بن جاؤ، عالم بن جاؤ، اور تم نہ چاہو تو وہ سب ناکام رہیں گے، اور اگر تم چاہو کہ تم کام کے آدمی بنو اور تم یہاں سے کچھ سیکھ کر نکلو اور تم اپنے بھی کام آؤ اور دوسروں کے بھی کام آؤ، اور اللہ کے دین کے بھی کام آؤ، تو پھر دنیا کی کوئی طاقت تمہیں اس سے روک نہیں سکتی، اور تمہارے لیے کوئی کمی نہیں، یہ پورا کارخانہ قدرت جو اللہ نے بنایا ہے، پورا عالم، ساری کائنات تمہاری مدد کرنے کے لیے تیار ہے، جو پانی اور ہوا میں اڑنے والے پرندے

---

(۱) سورۃ الانعام: ۱۲۲

اور پانی میں تیرنے والی مچھلیاں سب تمہارے لیے دعائیں کریں گی اور حدیث میں آتا ہے، یہ کوئی نئی سی بات نہیں ہے کہ طالب علم کے لیے، معلم الناس الخیر کے لیے جو لوگوں کو علم کی تعلیم دیتا ہے، نیک بات کی، حق بات کی تعلیم دیتا ہے، مچھلیاں پانی میں اور چڑیاں اپنے گھونسلوں میں دعا کرتی ہیں، اور فرشتے پر بچھاتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو علم حاصل کرنے کے لیے راستہ طے کرتے ہیں اور گھر سے نکلتے ہیں، تو سارا انحصار تمہارے فیصلہ پر ہے۔

اور دیکھو میں تمہیں بتا دیتا ہوں اور اس سے پہلے بھی کہا ہے کہ مدرسہ میں سارے انتظامات ہیں، نگرانی بھی ہے، اور ذمہ دار بھی ہیں، اور درجے بھی اپنے اپنے وقت پر شروع ہوتے ہیں، اپنے وقت پر ختم ہوتے ہیں، لائق اساتذہ بھی ہیں، شفیق اساتذہ بھی ہیں، لیکن تم اگر ان کو ناکام بنانا چاہو، مدرسہ کو ناکام بنانا چاہو تو بہت آسانی کے ساتھ بنا سکتے ہو اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوگی، کوئی کچھ نہیں کر سکے گا۔ تم سب کو ناکام بنا سکتے ہو، اور سب کو ہرا سکتے ہو، ہم سب ہارے، تم جیتے، اگر تم فیصلہ کر لو کہ ہم مدرسہ میں نہ پڑھیں، نہ لکھیں، نہ کام کریں، اور ہم پورا سال گزار دیں تو تم کامیاب رہو گے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم پاس بھی ہو جاؤ، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ امتیازی نمبروں سے پاس ہو، مگر تمہارے پلے کچھ نہیں پڑے گا، ایسے ایسے ہم نے اللہ کے بندے دیکھے ہیں اپنے زمانہ میں بھی اور ہر زمانہ میں کہ انھوں نے پڑھ کر نہیں دیا، استادوں اور ان کے والدین نے ان کے سامنے سر کاٹ کر رکھ دیا، اور سب سمجھتے رہے کہ یہ پڑھ رہے ہیں، لیکن دامن جھٹک کر وہ یہاں سے ایسے گئے کہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے چڑیا سمندر میں چونچ ڈالتی ہے اور اس کی چونچ میں پانی کا قطرہ بھی نہیں ٹھہرتا، ایسے ان پر گویا چھینٹ بھی نہیں پڑی، علم کی چھینٹ بھی نہیں پڑی، اور دامن بھی ان کا تر نہیں ہوا، کہنے والے نے کہا تھا کہ "باز می گوئی کہ دامن تر مکن" ویسے یہ بعض لوگ ہیں کہ دریا عبور کر جائیں اور دامن تر نہ ہو۔

ایک طریقہ یہ بھی ہے، اور ایک طریقہ یہ ہے کہ ساری رکاوٹیں ہیں لیکن اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ ہم کو علم حاصل کرنا ہے، کام کا آدمی بننا ہے، ہم اپنے لیے بھی، اپنے خاندان کے لیے بھی، اور اپنی ملت کے لیے بھی، اور خلق خدا کے لیے ہم کو ایک کار آمد آدمی بننا ہے، کچھ سیکھ کر

کے جاتا ہے، اپنی نجات کا بھی انتظام کرتا ہے، اور اگر اللہ توفیق دے تو دوسروں کی کشتی بھی پار
کرتی ہے، کنارے لے جاتی ہے، کتنے ایسے آدمی تھے کہ روزے سے تھے، کھانے کو کچھ نہیں ہوتا
تھا، جب بالکل ان کی جان پر بن آتی تھی اور غشی کھانے کے قریب ہو جاتے تھے تو کسی نان
بائی کی دکان پر جا کر کھڑے ہو جاتے تھے، (ذرا فاصلہ پر تاکہ یہ نہ معلوم ہو کہ بھیک مانگتے ہیں)
اور خوشبو جو ان کی ناک میں آتی تھی، گرم گرم روٹیوں کی جو تنور سے نکلتی تھیں، وہ توے پر چڑھتی
ہوتی تھیں، اس سے تقویت ان کی روح کو حاصل ہوتی تھی، اور کتنے ایسے واقعات ہیں کہ جو
عقل میں آنے والے نہیں ہیں لیکن واقعات ہیں، اور ہر زمانہ میں ایسی نظیریں رہتی ہیں۔

میرے عزیزو! اس وقت آپ کو دو فیصلوں میں سے ایک کرنا ہے اور اسی فیصلہ پر سارا
انحصار ہے، یہ کہ آپ کو پڑھنا ہے، وقت کو کارآمد بنانا ہے، اور یہاں آنے کو وصول کرنا ہے،
اور یہاں سے کام کا آدمی بن کر کے جانا ہے، تب تو پھر زندہ رہو اور چپہ چپہ تکا تکا آپ کی
مدد کے لیے زندہ کرنے کے لیے تیار ہے، اور سارے انتظامات اسی لیے ہیں، اور پھر کوئی
رکاوٹ نہیں ہے، کھانا خراب ملے، خدانخواستہ صحت خراب ہو، آپ کو کچھ تکلیف ہو، کوئی
بیماری ہو، کوئی چیز بھی آپ کا راستہ روک نہیں سکتی، اور پھر آپ اللہ تعالیٰ کی مدد دیکھیں گے اور
اللہ تعالیٰ کی نصرت ورحمت کا دروازہ کھل جائے گا، ما لا عین رأت ولا أذن سمعت ولا
خطر علی قلب بشر، جو اکل جنت کی صفت بیان کی گئی ہے، دنیا میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں
کو جنت کے مزے چکھا دیتا ہے اور جنت کے مزے ان کو اسی دنیا میں آنے لگتے ہیں کہ عالم
کو مسخر کر دیتا ہے، إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَٰنُ
وُدًّا[1] اپنے تمام بندوں کے دل میں ان کی محبت پیدا کر دیتا ہے، گویا کائنات مسخر ہو جاتی
ہے، لیکن آپ نے اگر یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں یہاں محنت کرنی ہے، اور ہمیں یہاں آنے کو وصول
کرنا ہے، اپنے والدین کو مایوس نہیں کرنا ہے، اپنے بزرگوں اور سرپرستوں کا دل نہیں دکھانا
ہے، اپنے استادوں اور یہاں کے منتظمین کو دھوکہ نہیں دینا ہے، اپنے نفس کو دھوکہ نہیں دینا
ہے، ہمیں نہیں چھوڑنا ہے، تو پھر میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ تم سے بڑھ کر خوش نصیب، اقبال مند

(۱) سورۂ مریم: ۹۶

کوئی نہیں، تم دنیا کے فاتح ہو، تمہارے لیے یہ عالم مسخر ہے، اور کوئی بڑی سے بڑی دنیا کی مادی طاقت تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتی، اللہ تعالیٰ نے تمہاری مدد کا فیصلہ فرما لیا اور تمہیں قبول کر لیا، اور تم قبول ہو گئے، پھر تمہیں کوئی دربار سے نکال نہیں سکتا۔

اور اگر تم نے یہ فیصلہ نہیں کیا کہ ہمیں محنت کرنا ہے، وقت کو ٹھکانے لگانا ہے، اس سے فائدہ اٹھانا ہے، اور تھوڑا جبر کر کے اور دل مار کر کے کچھ محنت کرنی ہے، تو ہم تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے، اور علوم کے جتنے بانی ہیں، امام رازی، امام غزالی اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ دہلوی ایسے حضرات بھی دنیا میں دوبارہ زندہ ہو کر یہاں آ جائیں اور تمہیں پڑھانے کے لیے بیٹھ جائیں تو وہ بھی تمہارے پڑھانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے، اور تم ان سے بھی ایسے ہی بے فیض اٹھو گے جیسے کسی معمولی سے معمولی شخص کے پاس سے۔

تھوڑے دن کی محنت عمر بھر کا آرام یا تھوڑے دن کا آرام عمر بھر کی شرمندگی؟

عزیزو! یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ وقت گزاریں اور کچھ نہ حاصل کریں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے آپ وقت گزاریں اور سب کچھ حاصل کر لیں، اور یہ بھی ہے کہ آپ تھوڑی تکالیف اٹھا لیں، دل ماریں، اور دل اور آنکھوں پر پتھر رکھ لیں، پھر اس کے بعد آرام ہی آرام ہے، عمر بھر آرام ہے، پھر اس کے بعد ہر بات میں آپ کی جیت، ہر بات میں آپ کی فتح، کوئی مشکل مشکل ہی نہیں۔

اور ایک صورت یہ ہے کہ آپ دل نہ مار سکیں، محنت نہ کریں، اس کے بعد قدم قدم پر مشکل، یہاں تو آرام کر لیں لیکن عمر بھر ہر جگہ آپ کو شرمندہ ہونا پڑے گا، ہر جگہ آپ کو منہ چھپانا پڑے گا، ہر جگہ آپ چاہیں گے کہ کوئی آپ کا نام نہ لے، کوئی آپ کو آواز نہ دے، آپ کی طرف کوئی دیکھے نہیں، کسی کو پتہ نہ چلنے پائے کہ آپ بھی مجلس میں ہیں، آپ کو یہ نہ کہے کہ مسئلہ بتا دیجیے، آپ کو کوئی یہ نہ کہے کہ کتاب پڑھ کر سنا دیجیے، اس عربی عبارت کا مطلب

بتا دیجیے، ہر جگہ چور کی طرح آپ اپنا منہ چھپانے کی کوشش کریں گے، اور ہر جگہ معلوم ہوگا کہ آپ نے کوئی قصور کیا ہے، ایسے لوگ دیکھے ہیں کہ تھوڑے دن آرام کر لیا اور پھر عمر بھر آنکھیں ملانے کے قابل نہیں رہے، کسی بڑے آدمی سے آنکھیں نہیں ملا سکتے، کسی بڑی مجلس میں بیٹھنے کی ان کو تاب نہیں، ہر جگہ چھپتے پھرتے ہیں کہیں ان کی قلعی نہ کھل جائے۔

اور جن لوگوں نے محنت کر لی ان کا حال یہ ہے کہ شیر ہو گئے، کہیں بھی بڑی سے بڑی مجلس بادشاہوں کی مجلس ہو، بڑے سے بڑے چوٹی کے عالموں کی مجلس ہو، علمی مذاکرہ ہو، بحث و مناظرہ ہو، کوئی تہذیبی مجلس ہو، کوئی علمی مجلس ہو، کہیں بھی ان کی آنکھیں نہیں جھپتیں اور ان کو شرمانے کی یا منہ چھپانے کی ضرورت نہیں، خود انتخاب کرو کہ یہ اچھا ہے کہ وہ اچھا؟ تھوڑے دن کی محنت عمر بھر کا آرام یا تھوڑے دن کا آرام عمر بھر کی شرمندگی؟

بدترین نفاق

میرے عزیزو! ابھی تعلیمی سال شروع ہوا ہے، اس میں ایک تو دھوکہ دینے کا، اپنے نفس کے ساتھ نفاق کرنے کا معاملہ ہے۔ اور بدترین منافق وہ ہے جو اپنے نفس کے لیے نفاق کرتا ہے، اپنے نفس کا بھی وہ مخلص نہیں ہوتا، اپنے نفس کے لیے سچ نہیں بولتا، یہ بدترین نفاق ہے، اگر نفاق سے آپ کو نفرت ہو اور عہد کریں کہ نفاق اپنے نفس کے ساتھ نہیں کریں گے، ہم واقعی محنت کریں گے، واقعی ہم وقت سے فائدہ اٹھائیں گے، تو پھر آپ کی زندگی کی کامیابی کے لیے، آپ کی محنت کی مقبولیت کے لیے، دین کے لیے، ملت کے لیے، دنیا کے لیے آپ کے مفید اور نافع بننے کی ضمانت ہے، قرآن میں ضمانت ہے، حدیث میں ضمانت ہے، آپ اپنے ساتھ انصاف کیجیے، اپنے خیر خواہ بن جائیے، آپ کو اپنے نفس کے ساتھ محبت ہونی چاہیے کہ ہم کچھ کام کے آدمی بن جائیں، ہمارا وقت کارآمد ہو، محنت کریں اور تھوڑے سے جو یہاں قوانین و ضوابط ہیں، ان کی پابندی کریں، جس سے ہمارے نظام صحت میں کوئی بہت بڑا اختلاف، کوئی بہت بڑی تبدیلی نہیں پیدا ہوگی کہ ہمارا نظام صحت درہم برہم ہو جائے اور بیمار پڑ جائیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اپنی نیت درست کر لیجیے، یہیں بیٹھے بیٹھے نیت کر لیجیے، نیت کرنے کے لیے کوئی زبان سے کہنے کی ضرورت نہیں، اپنے دل کو چند سیکنڈ کے لیے متوجہ کیجیے اپنی طبیعت کو، اور دل سے یہ کہیے کہ اے اللہ! ہم یہاں تیری رضا حاصل کرنے کے لیے آئے ہیں، تیرا علم دین سیکھنے کے لیے آئے ہیں تا کہ تیرے احکام ہم کو معلوم ہو جائیں، تیری شریعت کا علم حاصل ہو جائے، قرآن مجید سمجھنے کے قابل ہو جائیں، حدیث شریف سمجھنے کے قابل ہو جائیں، مسئلے مسائل بتانے کے قابل ہو جائیں، کتابیں سمجھنے کے قابل ہو جائیں، اور ہم اس ذریعہ سے اپنی نجات کا سامان فراہم کریں، ہمیں معلوم ہو کہ خدا کے عذاب سے کس طرح بچ سکتے ہیں، اور کس طرح جنت کا استحقاق اور تیری خوشنودی حاصل کر سکتے ہیں؟

دوسرے اس کے ساتھ یہ فیصلہ کر لیں کہ ہمیں یہاں شریف آدمیوں کی طرح، شریف بچوں کی طرح، شریف گھرانوں کے نونہالوں کی طرح، شریف لوگوں کی طرح رہنا ہے، یہاں کام کا آدمی بننے کے لیے آئے ہیں، پڑھنے کے لیے آئے ہیں، کچھ سیکھنے کے لیے آئے ہیں، اور اللہ اور اس کے رسول کو پہچاننے کے لیے، ان کی صحیح معرفت حاصل کرنے کے لیے، ان سے تعلق حاصل کرنے کے لیے آئے ہیں، پھر دیکھو اللہ تعالیٰ تمہاری کتنی مدد فرماتا ہے، اور قدم قدم پر تمہاری کس طرح سے مدد ہوتی ہے، اور پھر تم یہاں سے بن کر نکلو گے۔

زمانہ کے انقلاب کا شکوہ پست ہمتی اور حیلہ بازی ہے

میں تمہارے سامنے بیٹھا ہوا ہوں، اور بھی لوگ ہیں، الحمد للہ مجھے زمانہ کے انقلاب کا قطعاً کوئی شکوہ نہیں، زمانہ کا انقلاب کوئی چیز نہیں، یہ پست ہمتوں کی اور حیلہ بازوں کی باتیں ہیں، اللہ خالق ہے، اور ابدی ہے، اس کی صفات بھی ابدی ہیں، قدیم ہیں، اور ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گی، تو اللہ تعالیٰ جب رازق ہے تو ہمیشہ سے رازق ہے، ہمیشہ رازق رہے گا، جب وہ اپنے بندوں پر رحم کرنے والا ہے اور اس کا بنانے والا ہے ﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ (۱) وہ اپنے بندوں کو پہچاننے والا ہے، وہ نہ پہچانے گا تو کون پہچاننے والا ہوگا؟

---

(۱) سورۃ الملک: ۱۴

اور اس نے رزق کا ذمہ لیا ہے، وہ اپنے کو "شکور" کہتا ہے، وہ کسی کی نیکی کو ضائع نہیں کرتا اور پہچانتا ہے، اس کی قدر کرتا ہے، اس کی پرورش فرماتا ہے، اس کو انعام عطا فرماتا ہے، خوشی کا اظہار کرتا ہے، تو پھر اب کس بات کا ڈر ہے؟

اور یہ سب نہ کرنے کی باتیں ہیں، ساری کمزوری ہمارے اندر ہے باہر نہیں، انسان کے اندر یہ کمزوری ہے کہ اس کے اندر کوئی چیز ہوتی ہے اور باہر پھیلاور، انسان اپنے کو ذلیل سمجھتا ہے، تمام دنیا سے اس کو شبہ ہوتا ہے کہ سب اس کو ذلیل سمجھتے ہیں، حالانکہ کوئی اس کو ذلیل نہیں سمجھتا، اگر انسان اپنی عزت کرنا سیکھ لے اور انسان قابل عزت ہو تو اس کو کوئی بھی ذلیل نہیں سمجھ سکتا اور کسی سے اس کو شکایت کا موقع نہیں آئے گا، کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جب علم دین کی قدر نہ ہوئی ہو، آج بھی اس زمانے میں علم دین کی وہ قدر ہے جو دنیا میں کسی کی نہیں ہے، اور جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے واقعی علم دین دیا ہے، ان کا تو عالم یہ ہے کہ بادشاہوں کو خاطر میں نہیں لاتے، بادشاہوں کو آنکھیں ملانے کا موقع نہیں دیتے۔

تم کس دین، کس علم کو حاصل کرنے کے لیے آئے ہو، تمہیں خبر ہے؟ تمہیں اگر خبر ہو جائے، واللہ العظیم، تو تم تاب نہیں لا سکتے، اگر تمہیں معلوم ہو کہ تمہیں کیا مرتبہ ملنے والا ہے، تھوڑی سی محنت کر و تمہیں کیا نصیب ہوگا، تم کیا چیز بن جاؤ گے کہ زمین پر تمہارے پاؤں نہ پڑیں گے، تم میں کیا، اچھے اچھے عالی ظرفوں میں یہ ظرف نہیں ہے کہ اس کو برداشت کر سکے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو غیب میں رکھا ہے، اس کو غیب میں رہنے دو غیب کے سو پردوں میں رہنے دو، لیکن جب وقت آئے گا تبھی دیکھو گے۔

ہر لحظہ نظر کشا تجلی دارد فی مرغ
در سینۂ تو ماہ تمامے نہادہ اند

ہمت اور محنت کریں!

عزیزو! ہمت کرو، اس وقت فیصلہ ہونا ہے کہ تم لیں ہو یا تو سارے اسباب تمہارے لیے میسر نہیں، کسی بات کا شکوہ نہیں، نہ روزی کا شکوہ، نہ عزت کا شکوہ، نہ مسرت کا شکوہ، نہ کامیابی کا شکوہ، تمہارے لیے سب کی ضمانت ہے، اگر تم واقعی صاحب کمال بن جاؤ، محنت

امام بنا دیں گے ﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا﴾ صبر کیجیے، جو کھانے کو ملے کھاؤ، جو سرد گرم پیش آئے اسے برداشت کرو، زبان اور عادت کے اختلاف کو انگیز کرو، اور تقویٰ و صبر سے کام لو اور اللہ سے تعلق پیدا کرو تو یقیناً اہل کمال بن جاؤ گے، و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔[1]

---

(۱) دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ میں نئے تعلیمی سال کے موقع پر ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۹۸۲ء میں کی گئی تقریر، جسے مولانا شاہ ابو رحمانہ تسنیم عثمانی ندوی نے قلم بند کیا، ماخوذ از "تعمیر حیات" لکھنؤ (شمارہ ۱۰ ار نومبر ۱۹۸۲ء)۔

مدارس کا اصل سرمایہ

ذہن کو تیار کرنے کی ضرورت

آپ کا یہ تعلیمی سال شروع ہو رہا ہے، اور ہمارے وہ عزیز بھی جو رمضان المبارک کی تعطیلات میں گھر گئے تھے اور ابھی ان کی تعلیم کا حصہ باقی ہے، وہ بھی آ گئے ہیں، اور بہت سے عزیز طالب علم نئے داخل ہونے ہیں۔ اس لیے مناسب ہے کہ میں ان کا خیر مقدم بھی کروں اور کچھ ان کو مشورے دوں اور ان کو بتاؤں کہ وہ کس طرح اپنے اس آنے کو اور یہاں کے قیام کو زیادہ سے زیادہ کارآمد اور مفید بنا سکتے ہیں۔ بعض مرتبہ بڑے بڑے سفر اور بڑی بڑی مہمات کسی وجہ سے پورے طور پر نتیجہ خیز، انقلاب انگیز تو بڑی چیز ہے، مفید نہیں ہوتے کہ ان کے لیے پہلے سے ذہن تیار نہیں تھا، اور اس منزل کی عظمت اور اس سفر کی اہمیت، مقامات اور ماحول کی نزاکت اور اس سے فائدہ اٹھانے کے طریقے معلوم نہیں تھے، عبادات اور ارکان اسلام میں حج ایک ایسا رکن ہے کہ اس کے لیے سب سے زیادہ اہتمام کرنا پڑتا ہے۔

شعور کے ساتھ کام کرنے کی اہمیت

اہتمام کے تعلق سے مجھے یاد آیا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ جو انسانوں کا خالق ہے، اس نے تقریباً ہر رکن کے لیے، ہر فرض کے لیے ایسے انتظامات فرما دیے ہیں اور ایسے خارجی انتظامات اور اس کے راستے کی منزلیں ایسی متعین کر دی ہیں اور ایسے آداب مقرر کیے ہیں کہ انسان پوری بیدار مغزی کے ساتھ اور پوری تیاری کے ساتھ ان ارکان میں مشغول ہو، اور یہ حیثیت

انسانی بلکہ فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے، جو کام لا ابالی پن سے اور ذہن بغیر حاضر کیے ہوئے اور بے شعوری کے ساتھ انجام دیا جاتا ہے اس کے پورے ثمرات حاصل نہیں ہوتے۔

مجھ سے ایک بڑے طبیب اور بڑے تجربہ کار اور نفسیات شناس بزرگ نے فرمایا کہ جو ورزشی کام در جو ریاضتیں اور محنتیں بغیر ورزش کے ذہن کے کی جاتی ہیں ان کا وہ ثمرہ نہیں نکلتا جو انسانی جسم کی تعمیر اور انسانی جسم کی نشو و نما میں ان ورزشوں سے نکلتا ہے جن کے ساتھ ورزش کا ذہن ہوتا ہے، مثلاً انھوں نے کہا کہ سقوں کو دیکھو جو پانی بھرتے ہیں، سخت محنت کا کام کرتے ہیں، لیکن ان کے بازو پہلوانوں کی طرح مضبوط نہیں ہوتے اور ان کا نشو و نما اور ترقی ایسا نہیں ہوتا جیسا کہ پہلوان کا ہوتا ہے، اس لیے کہ پانی بھرتے وقت، مشکیں اٹھاتے وقت، لے جاتے وقت ان کا ذہن ورزش کا نہیں ہوتا بلکہ ان کا ذہن بیگار کا ہوتا ہے، یا روزگار کا ہوتا ہے، یہ ایک اچھی چیز ہے، لیکن اس سے ورزش کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

ایسے ہی بہت سے لوگ ہیں، لکھاں چھیلنے والے، بہت سے مزدور، اسٹیشن کے قلی، یہ سب جتنی محنت کرتے ہیں اگر مجموعی طور پر حساب لگایا جائے تو پہلوان اتنی ورزشیں نہیں کرتے ہیں، اتنے ڈنڈ نہیں پیلتے، اتنی بیٹھکیں نہیں کرتے جتنی لکھنؤ اور لکھنؤ سے بڑھ کر بمبئی اور کلکتہ، ہوڑہ کے اسٹیشن کا قلی کرتا ہے، لیکن آپ نے کسی قلی کو دیکھا کہ وہ گاما کی طرح مضبوط ہو، اس کے اعضاء کی مناسب نشو و نما ہوئی ہو؟ کیا بات ہے؟

حساب لگائیے گا تو میزان ان کی محنتوں کی زیادہ نکلے گی، لیکن چوں کہ ذہن اس طرف متوجہ نہیں ہوتا کہ ہمارا فلاں عضو مضبوط ہو اور اس میں گوشت آئے اور خون کا دوران صحیح طور پر ہو، اس لیے ورزش کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا، جیسے پیسے بھی مل جاتے ہیں، زور کھانا بھی ہضم ہو جاتا ہوگا، لیکن ورزش کا جو فائدہ انسانی جسم کی مضبوطی میں، اور اس کے سڈول بننے میں اور اس کے اعضاء کے خاص طور پر ترقی کرنے میں ہے، وہ نہیں ہوتا۔

عبادات میں شعور کا اہتمام

اسی لیے تشریع الٰہی نے، آسمانی تشریع نے اور الٰہی حکمتوں نے نماز کے لیے استحضار اور

وضو، اور پھر مسجد کو جاؤ تو یہ خیال کر کے جاؤ کہ تم نماز ہی میں اس وقت سے شامل ہو گئے، اور تمہارے یہ قدم جو پڑ رہے ہیں یہ سب عبادت میں شمار ہوں گے، نماز میں شمار ہوں گے، پھر جب مسجد میں قدم رکھو تو درود شریف پڑھو اور اَللّٰھُمَّ افْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ رَحْمَتِکَ پڑھو، پھر وہاں جو کر تحیۃ المسجد پڑھو، پھر سنن راتبہ ادا کرو، اور پھر اس دھیان کے ساتھ بیٹھو کہ نماز کا انتظار کرنے والا بیٹھتا ہے تو وہ نماز ہی میں محسوب ہوتا ہے، اور وہاں کوئی دنیا کی باتیں نہ ہوں ان سب کا مجموعی اثر یہ پڑتا ہے کہ پھر وہ پورا وقت ثواب کے سانچہ میں ڈھل جاتا ہے، اور اس کو وہ روحانی ترقی ہوتی ہے جس کو ہم آپ محسوس نہیں کرتے۔

ہم روحانی ترقی مجاہدات میں اور مراقبات میں اور تصوف میں زیادہ محسوس کرتے ہیں، لیکن مسجد میں صحیح نیت کے ساتھ بیٹھنے والے کو جو ترقی ہوتی ہے، اور جو حضوری اس کو حاصل ہوتی ہے، اور جو قرب خداوندی اس کو حاصل ہوتا ہے، اس کی لوگوں کو اہمیت معلوم نہیں ہے، قدر نہیں ہے، اس لیے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی تصوف کی چیز نہیں ہے، کوئی سلوک نہیں ہے، کوئی مجاہدہ نہیں ہے۔

میں آپ سے کہہ رہا تھا کہ سب سے مہتم بالشان رکن جس کے لیے بڑا اہتمام کر دیا گیا ہے، اور جس کی ساخت یہ رکھی گئی ہے کہ بغیر اہتمام کے وہ ادا ہی نہیں ہو سکتا وہ حج ہے، لیکن حج میں بھی جو لوگ حج کی تیاری نہیں کرتے (تیاری سے میری مراد پاسپورٹ یا ترمد اندازی وغیرہ کی تیاری نہیں ہے) یعنی اپنے ذہن کو تیار نہیں کرتے، حج کے فضائل اور حج پر جو اللہ تعالیٰ کے وعدے ہیں، اور حج کی جو روح ہے، اور حج کے جو مناسک ہیں، اور حکمتیں ہیں اور روحانی فوائد ہیں، جو لوگ حج کا اس نظر سے مطالعہ نہیں کرتے اور حج کی عظمت سے واقف نہیں ہیں، اور محرکات بھی ان کے اتنے عمیق اور اتنے صحیح نہیں ہیں جو ایک حاجی کے ہونے چاہئیں، تو بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ پورا حج کر لیتے ہیں اور فقہی حیثیت سے ان کا حج بھی صحیح ہوتا ہے، یعنی مفتی فتویٰ کی زبان میں یہی کہے گا کہ ان کا حج صحیح ہے اور کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ ان کا حج ادا نہیں ہوا، لیکن حج کا اصل فائدہ ﴿لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ﴾

وَيَذْكُرُوْا اسْمَ اللّٰهِ فِيْ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ ﴾(۱) اور پھر یہ کہ جس کو حج مبرور نصیب ہوا وہ ایسا پاک وصاف ہو جاتا ہے جیسے کہ حدیث میں آتا ہے کہ مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ اُمُّهٗ (۲) تو اس کی حالت یہ ہوتی ہے، اور کسی دن شیطان کو اتنا رسوا اور ذلیل وخوار نہیں دیکھا گیا ہے جتنا کہ عرفات کے دن دیکھا گیا، کس کثرت سے اللہ تعالیٰ مغفرت فرماتا ہے، پھر حج میں جو اللہ تعالیٰ نے انقلاب انگیزی کی شان رکھی ہے کہ زندگی سراسر تبدیل ہو جاتی ہے، بالکل مکمل طور پر تبدیل ہو جاتی ہے، اور انسان کی گویا اخلاقی حیثیت سے بھی، ذہنی حیثیت سے بھی از سرِ نو پیدائش ہوتی ہے، بہت سے لوگوں کو یہ چیز حاصل نہیں ہوتی، وہ چلے جاتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ زادِ راحلہ ہی شرط ہے، بیشک شرط ہے، اور اس کے بعد پورا حج کر کے چلے آتے ہیں اور کوئی فرق نہیں ہوتا، بعض اوقات (اللہ معاف کرے گستاخی ہوئی) الٹا اثر ہوتا ہے۔

بیت اللہ شریف پر تجلیات کی بارش

روحِ ابراہیمی اور عشقِ ابراہیمی کوٹ کوٹ کر، اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر، اور محمد رسول اللہ (ﷺ) کا اللہ تعالیٰ سے تعلق کوٹ کوٹ کر اب بھی بھرا ہوا ہے۔

بیت اللہ وہی، حرم وہی ؎

کعبہ را ہر دم تجلی می فزود

ایں ز اخلاصِ ابراہیم بود

آج بھی بیت اللہ شریف پر تجلیات کی بارش ہوتی ہے، اور جب بات آ گئی ہے تو میں عرض کر دوں، خود میرا بھی تجربہ ہے، شاید اللہ کسی کو وہاں لے جائے، ہمارے ایک بزرگ دوست جو خود صاحبِ باطن اور صاحبِ احوال تھے، انھوں نے مجھے خود قصہ سنایا کہ میں مکہ

---

(۱) سورة الحج: ۲۸ (۲) رواه البخاري في صحيحه عن أبي هريرة، كتاب الحج، باب فضل الحج المبرور، حديث رقم ۱۵۲۱

کے اندر استعداد پیدا کر دیتی ہے، اس کو اہل بنا دیتی ہے، یعنی گویا جیسے کوالی فائی (Qua.ify) کرنا کسی کو کہتے ہیں، وہ انسان کو اس کے لیے تیار کر دیتی ہے کہ اب وہ اس کے ثمرات کو جذب کرے، اس لیے نیت کی بڑی اہمیت ہے، تو ذہنی کیفیت پر بہت اثر پڑتا ہے۔

مثلاً ایک شخص ایک بڑے سے بڑے جامعہ میں، کسی زمانہ میں بغداد کا جامعہ نظامیہ تھا، نیشاپور کا جامعہ نظامیہ تھا، امام غزالی کا حلقۂ درس تھا اور کس کس کے حلقۂ درس تھے، اور کتنے کتنے مدارس تھے، اس پر مستقل کتابیں ہیں، اس مدرسہ میں یا کسی مدرسہ میں بھی اگر جانے والا اس کیفیت کے ساتھ جا رہا ہے کہ میں ایک باغ میں قدم رکھ رہا ہوں اور میں ایک ذوقی درجہ کا گل چیں ہوں، اور میں ایک ایک پھول کا اور ایک ایک کلی کا محتاج ہوں، اور یہ باغ کلیوں سے بھرا ہوا ہے اور مجھے اپنا دامن بھر لینا ہے، تو وہ دامن بھر کر کے آیا۔

اور اگر کوئی اس خیال سے وہاں گیا کہ کچھ بھی نہیں، کانٹے ہی کانٹے ہیں، لوگوں نے خواہ مخواہ گلستاں نام رکھ دیا ہے، یہاں تو بھوک ہے، پیاس ہے، تکلیف ہے، اچھا کھانا نہیں ملے گا اور معلوم نہیں کتنی ہمیں وہاں ناز برداریاں کرنی پڑیں، کتنی ہمیں سختیاں جھیلنی پڑیں گی اور کیا فائدہ ہے اس علم کا، اور کون سے بڑے استاد آسمان سے اترے ہیں، تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

اور بعض وقت یہ چیزیں انسان کی ذہنی کیفیت کی بہت حد تک تلافی کر دیتی ہیں بلکہ بعض اوقات بدل بن جاتی ہے، اگر اس جگہ میں کوئی کمی ہے اور مرکز میں کوئی کمی ہے تو اس کی بھی تلافی اس سے ہو جاتی ہے، ایسا دیکھا گیا ہے کہ دینے والے کے پاس زیادہ سامان نہیں، لیکن لینے والے کی ہمت بلند ہے اور طلب سچی ہے تو اللہ تعالیٰ نے دینے والے کی اس محدود پونجی میں برکت عطا فرمائی ہے اور لعل و جواہر سے دامن بھر دیا ہے، یعنی بہت سے لوگوں کو ایسے استادوں سے فائدہ پہنچا ہے جو سچ پوچھیے اگر باقاعدہ جانچ کی جاتی اور یہ کام کوئی پیمائش اور وزن کا ہوتا تو یہ فیصلہ ہوتا کہ اس استعداد والے کے لیے یہ استاد کافی نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے کم سطح استعداد والے استاد سے اس عالی استعداد والے طالب علم کو ایسا فائدہ پہنچایا جیسے کسی بڑے استاد سے فائدہ پہنچا، اور پہنچ سکتا ہے، اس کی صدہا مثالیں ہماری علمی تاریخ میں

ہیں، ہمارے مدارس کی تاریخ میں اور تعلیم و تربیت کے نظام کی تاریخ میں ہیں۔ بہت سے استادوں کے طالب علموں نے اپنے استادوں سے ایسا فائدہ اٹھایا کہ خود استادوں کو حیرت ہوئی، اور بعض اوقات تقریر کرتے وقت، درس دیتے وقت ان کو حیرت ہوئی کہ یہ مضامین کہاں سے آرہے ہیں۔

اور مجھے خود اس کا تجربہ ہے کہ بعض اہل طلب طالب علموں کے سامنے مجھے محسوس ہوا کہ میرے اندر کوئی تغیر ہوگیا ہے اور میرے اندر جیسے کوئی سوتہ پھوٹ گیا ہے، کوئی منفذ کہیں سے ایسا تھا جو بند تھا، اب کھل گیا ہے، اور اس میں قلب کو دخل ہے، مشتاق پوچھا جائے امام الحرمین بیشک بڑے پایہ کے شخص ہیں، امام جوینی ہیں، لیکن امام غزالی تو ان سے بھی بڑھ گئے، ایسے آپ کو صدہا لوگ ملیں گے جو اپنے استادوں سے بڑھ گئے ہیں، اس وجہ سے کہ ان کے اندر استعداد تھی اور طلب تھی اور قدر تھی، اور بعض اوقات تو ایسا ہوا ہے کہ بعض ذہین اور حساس طلبہ کو اپنے استادوں میں کچھ کمی محسوس ہوئی کہ وہ تسلی نہیں کر سکتے تو وہ ناکام ہوئے، لیکن جن سعید طالب علموں نے طے کر لیا کہ ہمیں انہیں سے فائدہ اٹھانا ہے، اور ہمیں انشاء اللہ انہیں سے فیض حاصل ہوگا تو وہ کامیاب ہوئے، تو وہ جو مولانا روم کا شعر ہے۔

آب کم جو تشنگی آور بدست
تا کہ آبت جوشد از بالا و پست

پانی کی فکر کم کرو اور پانی کم تلاش کرو، تشنگی زیادہ پیدا کرو تا کہ تمہارے پاؤں کے نیچے سے پانی ابلے، تا کہ آبت جوشد از بالا و پست، اوپر اور نیچے سے پانی ابلے اور پانی برسے۔

اپنی درسگاہ پر ناز

ہمارے عزیز بھائی جو اس سال پہلی مرتبہ آئے ہیں، وہ اپنے ذہن میں اپنے فائدہ کے لیے، مدرسہ کے فائدہ کے لیے نہیں کہتا، مدرسہ کو الحمد للہ جو کچھ بننا تھا، اس کو جو کچھ مشہور ہونا تھا، جو کچھ امتیاز پیدا کرنا تھا، پیدا کر چکا، اور اصل عزت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، اپنے فائدہ کے لیے میں کہتا ہوں کہ مدرسہ اور مدرسہ سے تعلق رکھنے والوں کی وقعت پیدا کریں، اور اس

یہ اللہ کا شکر ادا کریں، جتنا اللہ کا شکر ادا کریں گے، ان کے اندر شکر کا جذبہ پیدا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری صحیح رہنمائی فرمائی، ہم صحیح جگہ پہ آئے ہیں، ورنہ کہیں اور۔ انشاء اللہ یہاں سے فائدہ پہنچے گا، اور کہیں بہتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے، جو پورا فائدہ اٹھاتا ہے، انشاء اللہ ان کے حق میں بھی بہتر ہوگا۔

اور جن لوگوں کے دلوں میں شروع سے شبہ بیٹھا ہوا ہے، تردد ہے، کہ وہ اپنے مدرسے کے بارے میں، مدرسہ کے بارے میں، ساتھ ہی دوسرے میں، نظام تعلیم کے بارے میں، نصاب کے بارے میں اندیشے رکھتے ہیں، جس کی وجہ سے ذہنی کشمکش میں مبتلا ہیں، اس سے کیا ہوتا ہے؟ اس نصاب سے کیا ہوگا؟ یہاں پڑھ کر ہم کیا کرلیں گے؟ جامعہ ازہر یا سعودی عرب کی یونیورسٹی، مدینہ منورہ یا جامعۃ الامام محمد بن سعود وغیرہ جن کے نام آپ سنتے ہیں یا جن سے وہاں جاتے تو کچھ فائدہ بھی ہوتا، اور یہاں تو ہمیں عربی بھی نہیں آئے گی، یہ لوگ عجمی ہیں اور یہاں کا ماحول بھی عرب کا نہیں ہے، ہمیں کیا فائدہ ہوگا؟ تو ان کو وہ فائدہ نہیں ہوگا، اور صاف مجھے نظر آتا ہے، میرا تجربہ ہے، بحیثیت مدرس کے بھی، بحیثیت معتمد تعلیم کے بھی، بحیثیت ایک تاریخ کے خصوصی مطالعہ کرنے والے کے بھی کہ ایسے لوگوں کو علوم و فنون میں پختگی نہیں، وہ دوسرے کے لوگ رہتے ہیں اور بالکل دینے ہو جاتے ہیں۔

لیکن جن کے ذہن میں درسگاہ کا صحیح تصور ہوتا ہے، اس کے نظام کا، اس کے مقاصد کا، اس کے تخیل کا، اس کے طریقۂ تعلیم کا، ان کو بہت سی کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود فائدہ پہنچ جاتا ہے، یہ تجربہ ہے۔

اور مجھ کو ایک بڑی یونیورسٹی کے ایک بڑے پروفیسر اور بڑے ذہین اور جن کے ہاتھوں سے درجنوں آدمی پی ایچ ڈی کر کے نکلے، انھوں نے کہا کہ مولانا! ایک چیز ہمارے یہاں ہے جس کو (Sense of Pride) کہتے ہیں "الحس بالعزۃ" یعنی درسگاہ پر ناز، اس کو بہت دخل ہے، جن لوگوں کو اپنی درسگاہ پر، مدرس پر، اپنے ساتھیوں پر ناز ہوتا ہے، وہ بہت فائدہ اٹھاتے ہیں، اور پھر اللہ تعالیٰ ان سے بہت فائدہ پہنچاتا ہے، یہ سن کر آپ کا حظ ہے، مسلم

یونیورسٹی کا بہت بڑا سرمایہ اور اس کی بہت بڑی طاقت اپنی درسگاہ پر فخر اور ناز تھا، وہ یہ کہ ہم بہترین درسگاہ میں ہیں، ہماری درسگاہ کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبہ میں یہ بات ایسی بیٹھی ہوئی تھی کہ کیمبرج اور آکسفورڈ کے سامنے بھی ان کی آنکھیں نہیں جھکتی تھیں، ہمارے یہاں کے طلبہ میں آپس میں جو اتحاد ہے، جو رشتہ قائم ہو جاتا ہے، واقعی علی گڑھ برادری کا رشتہ ضرب المثل تھا، کوئی شخص کہیں چلا جاتا بے تکلف کسی علیگ کے مکان میں چلا جاتا، اور گھر والوں سے کہتا کہ میں علی گڑھ کا طالب علم ہوں، میں ٹھہروں گا۔

ایک صاحب نے واقعہ سنایا "قومی آواز" میں چھپا تھا کہ ہم کلکتہ گئے تو ہم نے کہا کہ کہاں ٹھہریں؟ ہوٹل میں ٹھہرنے کی سکت نہیں تھی، تو معلوم ہوا کہ یہاں ایک معروف روزنامہ کے ایڈیٹر علیگ ہیں، دفتر میں پہنچے اور ہم نے کہا کہ ہم علی گڑھ کے طالب علم ہیں، ہم آپ کے یہاں ٹھہرنا چاہتے ہیں، تو انھوں نے کہا کہ مجھے شرم آتی ہے کہ آپ پہلے میرے گھر نہیں گئے، پہلے یہاں آئے ہیں، آپ کو تو چاہیے تھا کہ پہلے وہاں جاتے، چائے پیتے، ناشتہ کی فرمائش کرتے، سامان رکھوا دیتے، کہتے ہمارا گھر ہے، ہمیں یہاں رہنا ہے، یہ نہ ہے وہ لا دیجئے، پھر آپ ہم سے ملتے اور کہتے کہ ہم ٹھہر گئے ہیں، اب آپ ہم سے پہلے کہتے ہیں کہ ہم آپ کے یہاں ٹھہریں گے، یہ تو علی گڑھ کی بات نہیں ہوئی۔

تو یہ بات کسی زمانہ میں ہمارے ندوی طلبہ، ندوی فضلاء میں بھی تھی کہ ایک ندوی دوسرے ندوی کو اپنا ہی بھائی سمجھتا تھا، بالکل بے تکلف، لوگ کہتے تھے کب کی ملاقات ہے، اور صرف رشتہ یہ ہے کہ ایک ہی درسگاہ میں دس برس پہلے انھوں نے پڑھا ہے، یہی بات کم و بیش بڑے مدارس میں تھی۔

پہلی بات

میرے عزیزو! پہلی بات تو یہ ہے کہ جب یہاں آئے ہیں تو اس میں آپ کا سراسر نقصان ہے، فائدہ کچھ نہیں ہے کہ آپ اس کو بے دلچسپی کی نظر سے دیکھیں، اپنے والدین پر آپ کو تعجب ہو، غصہ تو میں نہیں کہتا، تعجب ہو اور تھوڑی سی شکایت کہ ہم کو کہاں بھیج دیا، اس میں

آپ بالکل محروم رہیں گے، آپ کو فائدہ نہیں ہوگا، اب تو شکل یہی ہے کہ آپ اس پر خوش ہوں، اور یہاں آئے ہیں تو ندوۃ العلماء کی تاریخ پڑھیں، حضرت مولانا محمد علی مونگیری کا تذکرہ پڑھیں، حیات شبلی پڑھیں، اور ضرور پڑھیں، حیات عبدالحی پڑھیں، اور ندوۃ العلماء کی تاریخ پر جو چیزیں ہیں ان کو پڑھیں، اور ان سے ذہنی اتفاق پیدا کرنے کی کوشش کریں، اس کے تخیل کو، اس کے مقاصد کو جذب کرنے کی کوشش کریں، پھر اس کے بعد جو ماحول یہاں ہے اس کو غنیمت نہیں بلکہ نعمت سمجھیں، آپ یہ سمجھیں کہ ذرا فائدہ تو یہاں رہنے میں ہے۔

اور میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میں ۱۹۵۱ء میں مصر گیا، میری عمر ۳۶-۳۷ سال رہی ہوگی، چالیس سال سے شاید کم ہی تھی، تو مجھے وہاں ایسے لوگ ملے جو سالوں سے تھے اور ان کو اس وقت تک عربی بولنی نہیں آتی تھی، اور جب لکھتے تو پتہ میں نحوی غلطی کرتے تھے، اور ایک شخص کے دستخط سے واقف نہیں تھے، طہ حسین بھی زندہ تھے، عباس محمود العقاد بھی زندہ تھے، احمد امین بھی زندہ تھے، منصور علی پاشا، احمد پاشا اور محب الدین الخطیب اور بڑے بڑے اہل قلم جن کے اہم مضامین پڑھتے تھے با حیات تھے، ہم یہاں تمنا کرتے تھے کہ کبھی ان کو دیکھیں، وہ اس زمانے کا آخری عہد تھا، خدا نے مجھے صحیح موقع پر پہنچایا، وہ نسل زندہ تھی، یہی شام کا حال تھا، العلامہ کرد علی، علامہ بہجۃ البیطار اور بڑے بڑے علماء زندہ تھے، پھر اس کے بعد چل چلاؤ شروع ہوا، بعض ۶۰-۷۰ کے پیٹے میں تھے، بعض ۷۵-۸۰ کے پیٹے میں تھے، اور جب جانا شروع ہوا تو وہ قافلہ ایک دم سے چلا گیا، اور مصر خالی ہو گیا، تو میں جب وہاں گیا تو مجھے کوئی چیز نئی نہیں معلوم ہوئی، اس لیے کہ میں تقریباً سب کو پڑھ چکا تھا اور سب کے متعلق اپنے ذہن میں اور اپنے احساس و دل اور اپنے جس ماحول میں رہتا تھا، ان کے متعلق میرے ذہن میں ایک ترتیب قائم ہو گئی تھی، اور ان کی خوبیاں اور ان کی کمزوریاں بھی مجھے معلوم تھیں، تقریباً ہر ایک سے میں اس طرح ملا جیسے ہندوستان کے ادیبوں اور شاعروں سے، بلکہ ان سے بھی اتنا واقف نہیں تھا، اس لیے کہ میرا اشتغال عربی ادب اور زبان سے بہ نسبت اردو زبان و ادب کے زیادہ تھا، ویسے گھر کی تربیت اور ماحول کی وجہ سے شعر و شاعری کا عام چرچا تھا، میں ناواقف نہیں تھا، لیکن عرب ادباء کو تو میں، کسی کی پوری پوری کتاب، ایک ایک فقرہ، ایک ایک حرف

میں نے پڑھا تھا، احمد امین کی فجر الاسلام، ضحی الاسلام کا ایک حرف نہیں چھوڑا تھا، اس کے حاشیہ پر میری رائیں لکھی ہوئی ہیں، اور وہ میرے نواسے [illegible] کے کتب خانہ میں اب بھی موجود ہیں، اس لیے آپ یہاں کے ماحول سے فائدہ اٹھائیں، اور اگر آپ یہاں علمی و روحانی ورزش کی نیت کے بغیر اور اس کا ذہن پیدا کیے بغیر یہاں چار چھ برس رہیں گے تو آپ کو فائدہ نہیں ہوگا۔

اللہ کا شکر ادا کریں

دوسری بات یہ ہے کہ جو میسر ہے، جو اللہ نے آپ کو نصیب کیا ہے، اس پر شکر کریں، میں اس لیے نہیں کہتا کہ میں ندوۃ العلماء کا ناظم ہوں یا یہ ماحول مجھے اپنے ادارہ کی تعریف کرنی ہے کہ اچھا ہے، بلکہ اس لیے کہتا ہوں کہ میں اس میں آپ کا فائدہ سمجھتا ہوں، اور آپ کا اس میں فائدہ ہے کہ آپ یہاں آئے ہیں تو اس کو اپنے لیے موزوں ترین جگہ سمجھیں اور اپنے استاذوں کو یہ تقدم دیں کہ وہ آپ کی پوری پوری رہنمائی کر سکتے ہیں اور آپ کو پورا فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔

وقعت پیدا کریں

تیسری بات یہ ہے کہ وقعت پیدا کریں، بغیر وقعت کے بالکل فائدہ نہیں، کوئی کتنی بھی جانے، اگر کوئی معقولات پڑھے اور معقولات کی وقعت نہ ہو تو معقولات کا علم بھی نہیں آئے گا، جب آپ کسی چیز کی افادیت سمجھیں گے تب وہ چیز آپ کو حاصل ہوگی، یہ اللہ کی سنت ہے اور یہی انسانی نفسیات ہے۔

اپنے وقت کو کارآمد بنائیں

اور چوتھی چیز یہ ہے کہ آپ اپنے وقت کو کارآمد بنائیں، اور اپنے اساتذہ سے درس کے علاوہ اوقات میں بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں، اور ان سے ارتباط پیدا کریں، اور ان

سے آپ کا ذاتی رابطہ ہو، ان کی مجلسوں میں بیٹھیں، ان کی ہر بات غور سے اور وقعت سے سنیں، اور ذہن میں کچھ سوالات تیار کریں کہ ہم کس ترتیب سے مطالعہ کریں؟ ہم اپنی عربی اچھی کرنے کے لیے کون سی کتابیں پڑھیں؟ کس دور کی کتابیں پڑھیں؟ کن مصنفین کی کتابیں زیادہ سے زیادہ پڑھیں؟ کتاب کے مطالعہ کا کیا طریقہ ہے؟ وہ بتایئے، ایک کتاب ہم پڑھتے تو بہت ہیں لیکن یاد نہیں رہتی، ہم کس طرح اس کا مطالعہ کریں کہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے اور آئندہ بھی ہم اس سے کام لے سکیں؟ وہ شاید آپ کو کچھ تجربے کی روشنی میں بتائیں گے کہ اس کو پہلی دفعہ یوں پڑھیں، دوسری مرتبہ یوں پڑھیں، ورنوٹس بھی لیں، اگر وہ اہل قلم ہیں تو ان کی تحریروں کو وقعت کی نگاہ سے دیکھیں، اور ان کی تقلید کی کوشش کریں، اور وہ جن لوگوں کو بتائیں کہ یہ آپ کے لیے اچھا نمونہ ہیں آپ ان کی تقلید کیجیے، ان کا اسلوب اختیار کیجیے۔

جب مولانا شبلی یہاں تھے ان کی شخصیت بڑی موثر اور دل آویز تھی، اللہ تعالیٰ نے ان میں ایسی شخصی کشش عطا کی تھی کہ جو لوگ ان کے پاس بیٹھتے تھے وہ ان کے دل ودماغ میں سما جاتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ ان کے برابر نہ کوئی عالم ہے نہ ادیب، نہ کوئی خطیب، نہ کوئی ذہین نہ کوئی مصنف، اور ان لوگوں کو ان سے فائدہ پہنچا، ان میں سرفہرست مولانا سید سلیمان ندوی ہیں، انھوں نے گویا مولانا شبلیؒ کو اپنے اندر اتار لیا تھا، ان کی محبت، ان کی عقیدت سے کیا چیز بن گئے تھے، اور پھر دوسرے نمبر پر مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ہیں، اگرچہ وہ یہاں کے طالب علم نہیں تھے، مولانا عبدالباریؒ ہیں اور ڈاکٹر امراللہ خاں صاحب ندوی ہیں، حاجی معین الدینؒ احمد صاحب ندوی ہیں، مولانا عبدالسلام صاحب مرحوم ہیں، اور بعض لوگ ان کو مولانا شبلی کے اسلوب کو اخذ کرنے اور اس کو کامیابی سے نقل کرنے میں سید صاحب پر بھی ترجیح دیتے ہیں۔ سید سلیمان ندوی کی تو ایک دوسری شخصیت ہی پیدا ہوگئی تھی۔ ان میں دو شخصیتیں مل گئی تھیں، ان کی اپنی شخصیت جو بعد میں اپنی محنت سے (Develop) انھوں نے پیدا کی، اور خود ان کے خاندانی اثرات، اور وہ شخصیت جو مولانا شبلیؒ کی صحبت میں بنی، لیکن مولانا عبدالسلام کی شخصیت ابھری تھی، وہ مولانا شبلیؒ ہی کے اثر سے پیدا ہوئی، تو اس کا اتنا اثر پڑتا ہے۔

اور ارتجاعات اور کوششوں کے ساتھ اس کے لیے تیار رہتا ہے۔

مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ جب میں یمن پہنچا تو وہاں کے متعدد معتمد و ثقہ اور ذمہ دار لوگوں نے بتایا کہ اس ملک کو کمیونسٹوں کے قبضہ میں جانے اور ارتداد کے شکار ہو جانے سے جن چند رہ آدمیوں نے بچایا، یہ وہ لوگ تھے (مجھے آپ سے کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ آپ ایک خاص ماحول میں رہتے ہیں) جنھوں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، سید قطب شہید اور ابوالحسن علی ندوی کی کتابیں پڑھی تھیں، وہ یہ سمجھتے تھے کہ سیاسی انقلاب یا کمیونسٹ حکومت کے قبضہ کرنے کا کیا مطلب ہوتا ہے، مستقبل کو بدلنے آئندہ نسلوں کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کے کیا وسائل پیدا ہو گئے ہیں، اور لوگوں کا ذہن کیا کام کرتا ہے۔

آپ لوگ یہ سمجھیں کہ جو کام آپ کے یہاں لکھنے پڑھنے کا ہو رہا ہے، یہ حقیر نہیں، ہم نے الحمد للہ ایسے ملکوں اور ایسے طبقوں میں ان کوششوں کو پہنچتے ہوئے پایا جہاں ایک بڑا ممتاز طبقہ اس سے متاثر ہے، اس کا محرک اس ندوۃ العلماء کی بنیاد ہے، جس کی بنیاد مولانا محمد علی مونگیری اور علامہ شبلی نعمانیؒ (میں ان دونوں کے نام خاص طور پر لیتا ہوں) نے رکھی اور جس کی تعمیر و ترقی میں ان دونوں کا بنیادی حصہ ہے، انھوں نے ہوا کا رخ پہچان لیا تھا کہ اب ہوا کا رخ عوام کی طرف سے آنے والے انقلابات کی طرف نہیں جو فوجوں کے راستے سے آئیں گے، بلکہ اب جو انقلابات آئیں گے وہ خیالات و افکار کے لشکر سے آئیں گے اور فکری راستوں سے آئیں گے۔

آپ اس چیز کو ذہن میں رکھیں اردو و عربی میں دعوت کا کام اور افکار و خیالات کے نشر و اشاعت کی قیمت سمجھیں، عربی تعلیم یافتہ طبقہ پڑھنے لکھنے کا مریض ہے، آپ اس کو غذا دیں، آپ اپنے کو دینی، علمی ہر حیثیت سے دعوت کے لیے تیار کریں، اسی کے لیے "معہد العالی للدعوۃ و الفکر الاسلامی" کی بنیاد پڑی ہے، اس کو اس وقت کا جہاد اور عبادت سمجھیں، و آخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔[1]

---

(۱) ذیقعدہ ۱۴۰۲ھ مطابق اگست ۱۹۸۲ء میں کی گئی ایک تقریر کا خلاصہ، ماخوذ از "تعمیر حیات" (شمارہ ۲۵/اگست ۱۹۸۲ء)۔

تقویٰ اور صبر کامیابی کے دو ستون

میرے عزیزو اور بھائیو!

انسان کے غور کرنے کے لیے، اپنی زندگی کو بنانے اور ترقی دینے کے لیے، اور اپنی سیرت بہتر ثابت کرنے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ کوئی نامعلوم حقیقت یا کوئی نئی بات کہی جائے، عام طور پر جن حقیقتوں پر انسان کی زندگی کی اصلاح و ترقی کا دارومدار ہوتا ہے، وہ آشکارا ہیں، اور خود اللہ کے آسمانی صحیفوں میں، اللہ کے محبوب بندے انبیاء (علیہم السلام) کی سیرت و واقعات میں اور پھر اللہ کے مخلص و مقبول بندوں کے حالات میں وہ حقیقتیں موجود ہیں اور اکثر مکرر آئی ہیں، جس طریقہ سے کہ انسان کی مادی و جسمانی زندگی کا دارومدار جن چیزوں پر ہے، وہ عام ہیں، ان میں کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے، اسی طرح جو بنیادی باتیں ہیں، انھیں بھی معلوم کرنے کے لیے کسی پہیلی کا بجھانا یا کہیں دور کی کوڑی لانا ضروری نہیں۔

اصل میں وہ رابطہ اصل ہے جو انسان کے حدود اور انسان کی قوت ارادی اور ایک طے شدہ حقیقت یا ایک صحیح علم کے درمیان ہونا چاہیے، یہ رابطہ کبھی مضبوط ہوتا ہے اور کبھی بہت کمزور ہوجاتا ہے، ایسا کمزور ہوجاتا ہے کہ اس کا کوئی اثر زندگی پر نہیں ہوتا، مادی زندگی ہو، یا روحانی و اخلاقی زندگی، یا علمی و شعوری زندگی ہو، سب میں اس رابطہ ہی کا تکمیل ہے، پھر انسان کے شعور، قوت ارادی، موجودات کے حقائق کے درمیان اس رابطہ ہی کو قائم کرنے اور مضبوط کرنے کے لیے انبیاء (علیہم السلام) کی بعثت ہوتی رہی ہے۔

میں اس وقت ایسی ہی باتیں آپ لوگوں کے سامنے کہنے جا رہا ہوں، جو صرف ذرہ انبساط کے درجہ میں نہیں اتر تیں، جتنی اچھی باتیں جب آخر لوگوں کو معلوم ہوتی ہیں، صرف

ان اچھی باتوں پر عمل کرنے کا جذبہ دو فیصلہ کمزور ہو چکا ہوتا ہے، کچھ ایسے موانع پیدا ہو جاتے ہیں جو اس جذبہ کو سلب کر لیتے ہیں، اور عزم کو ختم کر دیتے ہیں، اسی عزم کو تازہ کرنا، جذبہ کو گرم کرنا اور اس کو فروزاں کرنا یہی انبیاء (علیہم السلام) کا پھر ویسے اپنے زمانے کے داعیوں کا کام ہوتا ہے۔

حضرت یوسف (علیہ السلام) کا قصہ

حضرت یوسف (علیہ السلام) کا قصہ ان قصوں میں ہے جو قرآن میں بڑی تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں، اور جن کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، ﴿نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَٰذَا الْقُرْآنَ وَإِن كُنتَ مِن قَبْلِهِ لَمِنَ الْغَافِلِينَ﴾ [(۱)] اور ﴿لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۗ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ﴾ [(۲)] یہ ہمارے کے سارے قرآن مجید میں جو ارشادات ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کے قصہ سے انسانی زندگی کی تعمیر و ترقی میں اور انسان کو مدارج عالیہ تک پہنچنے میں بڑی رہنمائی ہو سکتی ہے، اور اس میں بڑی تسلی و تسکین کا سامان موجود ہے، جب حضرت یوسف (علیہ السلام) کی بحیثیت عزیز مصر اپنے بھائیوں سے گفتگو ہوئی اور انھوں نے کہا کہ کیا تم کو یاد ہے کہ تم نے یوسف اور ان کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا؟ تو وہ سب ایک دم سے چونک پڑے، اس لیے کہ یہ قصہ یا تو خدا کو معلوم ہے یا یوسف کو، اور ظاہر ہے یہ خدا تو ہو نہیں سکتے، چنانچہ انھوں نے بڑے اچنبھے کی حالت میں کہا کہ ﴿أَإِنَّكَ لَأَنتَ يُوسُفُ﴾ ارے کیا آپ یوسف ہیں؟ انھوں نے کہا: ﴿أَنَا يُوسُفُ وَهَٰذَا أَخِي﴾ میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔

اب یہاں پر میں آپ سے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ اگر مجھ سے کوئی پوچھنے والا پوچھے کہ ایک آیت کا انتخاب کیجیے جو بیک وقت سب پر صادق آ سکے تو میں کہوں گا کہ وہاں وہ آیت یہ

(۱) سورۂ یوسف: ۳ (۲) سورۂ یوسف: ۱۱۱

قانون الٰہی

زندگی کے مرحلوں سے جن کو گزرنا ہے، جن کو مختلف آزمائشیں پیش آتی ہیں، ان کے لیے دشوار سے دشوار ترین حالات میں، نازک سے نازک ترین مواقع پر، پیچیدہ سے پیچیدہ حالات رکھنے والے ممالک میں، تاریخ کے دوروں میں اور ہر ماحول میں جو بالکل صحیح کا کام کر سکتی ہے، وہ ہدایت یہ فقرہ ہے جسے میں آپ کے سامنے آج پھر دہرا رہا ہوں کہ انھوں نے اپنے متعلق تو کہا اور اس کے بعد قیامت تک لیے ﴿وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾[۱]، جو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس کو کلمہ باقیہ بنا کر چھوڑ دیا گیا، گویا ایک صحیح ہدایت، ایک عالمی بصیرت اور ایک دستور العمل بنا کر چھوڑ دیا کہ دیکھو میرا اور میرے بھائی ہی کا معاملہ نہیں، خدا کا اصول یہ ہے ﴿وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا﴾، ہر نسل کے لیے، ہر قوم کے لیے، ہر جماعت کے لیے، ہر ادارے کے آدمیوں کے لیے، مجاہدین اسلام کے لیے، اللہ کا کلمہ بلند کرنے والوں کے لیے، اصولوں اور صحیح مقاصد پر قائم رہنے والوں کے لیے، سب کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے کردہ قانون یہ ہے، الفاظ کی عمومیت دیکھیے کہ ﴿إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾ ، اسم موصول اور اس کے ساتھ جو افعال و متعلقات ہیں، وہ سب بتاتے ہیں کہ "من" کون ہے، یہ جس کے متعلق کہا جا رہا ہے، ان کی کیا صفات مطلوب ہیں؟ وہ کون لوگ ہیں ﴿إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ﴾ خدا کا عام قانون یہ ہے کہ ہر دور اور ہر زمانہ میں جو تقویٰ اور صبر دو باتوں پر عمل کرے گا، ﴿فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾ "اللہ تعالیٰ نیک کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرے گا"، اس میں بھی عمومیت و اطلاق ہے، اگر وہ فرما دیتے کہ اس کو بادشاہی ملے گی، اس کو سرداری ملے گی، اس کو پیشوائی ملے گی، اس کو رزق وافر ملے گا، اس کو عزت ملے گی، اس کو قیادت ملے گی، سب محدود و متعین چیزیں ہیں، اس کو بھی پسند نہیں کیا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے وہ الفاظ کہلوائے ہیں جو اول سے آخر تک سب کے لیے بالکل عام الفاظ ہیں، یہ کلیہ قاعدہ ہے اور سب انسانوں کی میراث ہے، اس میں کسی کی تخصیص نہیں۔

---

(۱) سورۃ الزخرف: ۲۸

تقویٰ کا مفہوم

﴿إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ﴾ ، جو خدا سے ڈرے گا، اور نامناسب چیزوں سے پرہیز کرے گا، تقویٰ کے معنی کیا ہیں؟ تقویٰ کے معنی صرف خوفِ خدا یا کثرتِ عبادت کے نہیں جیسا کہ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ تقویٰ ایک ایسا مثبت عمل ہے جس میں منفی شامل ہے، بعض مثبت عمل وہ ہوتے ہیں جو نفی پر مشتمل ہوتے ہیں، یعنی مجموعہ ہوتے ہیں مثبت و منفی اور ایجاب و سلب کا، تقویٰ وہی چیز ہے جس میں ایجاب و اثبات بھی ہے لیکن نفی پر وہ قائم ہے، اور وہ ہے ان تمام چیزوں سے بچنا جو اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور اس کے یہاں خصوصیت حاصل کرنے اور زندگی کی کامیابی کے منافی ہوں، پہلی چیز ہے پرہیز اور دوسری چیز ہے تحمل، جسے یوں کہہ لیجیے پرہیز اور رضا، یا پرہیز اور توازن، ﴿إِنَّهُ مَن يَتَّقِ﴾ تو ہے پرہیز اور ﴿يَصْبِرْ﴾ ہے مزاج یا رضا، یعنی دو چیزیں ہیں جو ان نامناسب چیزوں سے جن کا تعارض ہے اللہ تبارک و تعالیٰ کے یہاں کی کامیابی سے، اس کے نزدیک کامرانیوں اور مقبولیت سے، اس کے یہاں کی محبوبیت سے اور اس کا مؤید، موفق اور منظور بننے سے، ان سے تو کرے پرہیز، ان کو ہاتھ نہ لگائے، اور ان سے دور رہے، پھر اس کی تعلیم پر عمل کرنے میں جو مشکلات پیش آئیں ان کو برداشت کرتا رہے، یہ ہے صبر یعنی وہ استقامت دکھائے اور مشکلات کو برداشت کرے۔

پھر فرماتے ہیں: ﴿فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾، یہ کیسی بات ہے جیسے بادشاہ کہے کہ اگر کسی نے ایسا ویسا کیا تو پھر ہم دیں گے، اور ہم ابھی نہیں بتاتے کہ کیا دیں گے، اسی وقت معلوم ہو جائے گا کہ ہم کیا دیتے ہیں؟ تو آدمی کیا کیا سوچ سکتا ہے، یہاں بھی انھوں نے ایسی بات کہی جو بالکل ہر شخص کے لیے مناسب حال ہے، اگر بادشاہی کہتے تو ہر ایک کے لیے بادشاہی مناسب نہیں، اور ہر ایک کے لیے یہ نعمت بھی نہیں، اسی طرح سے حکومت بہت سے لوگوں کے لیے بڑا امتحان بلکہ سزا ہے، ایسے ہی دولت بھی ہر شخص کے لیے مناسب نہیں، اسی طرح کوئی بھی چیز آپ طے کیجیے گا، وہ سب کے لیے مناسب حال نہیں

ہو سکتی، لیکن ﴿فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾، میں ایسی چیز آ گئی ہے جو سب پر حاوی اور سب کے مناسب حال ہے کہ اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کے اور دین کے کام کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ جو کچھ دے گا ہو وقت پر دیکھنا۔

تو میرے عزیزو! جو کسی صحیح مقصد کے لیے کہیں اپنی زندگی کا کوئی وقفہ، کوئی مدت صرف کریں، وہ کسی راہ کے مسافر ہوں، اور کسی کارواں کے وہ شریک ہوں، ان کے بے سب سے بڑھ کر کامیابی کی ضمانت دو چیزیں ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف (علیہ السلام) کی زبان سے نکلوایا ہے، اور انسانی نسلوں کے لیے چھوڑا ہے ﴿إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ﴾ کہ دو باتیں کرنی ہیں، خدا کی شان کے نامناسب چیزوں سے اور مقصد کو نقصان پہنچانے والی چیزوں سے پرہیز و احتیاط، اور مقصد کے حصول کی راہ میں جو مشکلات پیش آئیں ان کو برداشت کرنا، بس اس کے بعد ایک مقام و مرتبہ حاصل ہوتا ہے، اس کا تعلق اللہ سے ہے، ہم سے نہیں۔

تقویٰ اور صبر کامیابی کے دو ستون

میرے عزیزو! بس ایک بات ہے کہ اس وقت آپ کسی عمر کے ہوں، کسی درجہ کے طالب علم ہوں، آپ کسی خاندان اور برادری سے تعلق رکھتے ہوں، آپ کہیں سے آئے ہوں، اور آپ کے دل میں کیسے کیسے ولولے اور ارمان ہوں، سب کے لیے راستہ یہی ہے کہ ہم دو چیزوں پر عمل کریں، ایک تو یہ کہ ہمارے مقصد، یہاں کے اصول و ضوابط، شرائط اور ضروریات و لوازم سے جو چیزیں میل نہیں کھاتیں، اور جن کا ان سے جوڑ نہیں ہے، ان سے تو پرہیز کریں، اور احتیاط برتیں، اپنی خواہشات پر قابو پالیں اور دل مار لیں، تھوڑا اسا بس اور کچھ نہیں، تقویٰ اور صبر، یہ دو چیزیں ہیں جو بالکل کافی ہیں، یہ دو ستون ہیں جن پر ہمارے مستقبل کی پوری عمارت کھڑی ہے۔

اگر آپ سے کہا جاتا ہے کہ آپ وقت ضائع نہ کریں، غلط جگہوں پر نہ جائیں، غلط جگہوں میں نہ بیٹھیں، غلط مشاغل میں آپ وقت صرف نہ کریں، تو یہ سب تقویٰ کے تحت آ جاتے ہیں، تقویٰ ایسی چیز نہیں کہ وہ صرف اولیاء اللہ ہی کے لیے ہو، وہ ہر ایک کے مناسب

میرے عزیزو اور بھائیو! یہی باتیں آپ سے کہنی تھیں، ہر ایک آدمی کے موافق اور اس کے مقام کے مطابق بات کہی جاتی ہے، ایک مدرسہ اور پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء، جس کی دنیا میں شہرت وعزت ہے، عام بھائیوں کو معلوم بھی نہیں کہ دنیا کس نظر سے دیکھتی ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے محض اپنے فضل سے (یہ اللہ تعالیٰ کا ایک امتحان ہے اور وہ اس امتحان میں کامیاب کرے) اس وقت جیسے ایک ہوا چلا دی ہو، من جانب اللہ ایک چیز پیدا ہوگئی ہے، مجھے واسطہ پڑتا ہے اور شرم معلوم ہوتی ہے کہ یہ لفظ توحی عزت رکھ، کس قدر لوگ اس وقت ہندوستان سے باہر ممالک عربیہ میں اور دور دراز ملکوں میں تو ندوہ کو، ندوہ کے خاص لوگوں کو، اور ندوہ سے تعلق رکھنے والوں کو دیکھتے ہیں، اس کا اندازہ ہی نہیں، ایسی حالت میں پست اور ناقابل ذکر چیزوں کا نام لیں اور کہیں کہ اے بھائیو، اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنے والوں کی تقلید نہ کرو، ان کا لباس اختیار نہ کرو، ان کا شعار اختیار نہ کرو، تمہارے بال ایسے نہ ہونے چاہئیں، ایسے ہونے چاہئیں، تمہاری صورت ایسی ہونی چاہیے، تو یہ سب باتیں آپ کے مقام سے فروتر ہوں گی، اور ہماری زبان ساتھ نہیں دے سکتی کہ میں ایسی باتیں آپ سے کہوں، آپ کا مقام اور آپ کا معیار بہت بلند ہے۔

بس آپ تقویٰ اور صبر اختیار کرلیں، یہ دو شہپر ہیں جن سے آپ اونچی سے اونچی سطح میں اور بڑے سے بڑے آفاق میں پرواز کرسکتے ہیں، اور یہ کوئی ایسی مشکل و ناممکن بات نہیں، ورنہ اس طرح عمومیت کے ساتھ نہیں کہی جاتی، تاریخ میں ہزاروں نہیں لاکھوں ایسے واقعات ہیں کہ لوگوں نے تھوڑا سا اس پر عمل کیا اور وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئے، آپ علماء اسلام کی تاریخ پڑھیے، آپ تاریخ دعوت وعزیمت پڑھیے، آپ اور مشاہیر اسلام کے تذکرے پڑھیے، سب میں آپ دیکھیں گے کہ ہر دور میں لوگ انھی دو چیزوں سے کامیاب ہوئے: تقویٰ اور صبر، وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔(۱)

---

(۱) دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں اساتذہ وطلاب کے سامنے ۱۲/جمادی الاولیٰ ۱۴۰۵ھ (فروری ۱۹۸۵ء) میں کی گئی ایک تقریر، یہ تقریر عبدالحلیم راہی نے قلمبند کی، ماخوذ از "تعمیر حیات" لکھنؤ (شمارہ ۱۰/مارچ ۱۹۸۵ء)۔

چار باتیں

میرے عزیزو اور بھائیو! دارالعلوم اور اکثر دینی مدارس کا دستور رہا ہے کہ تعلیمی سال کے آغاز میں مدرسہ کا کوئی ذمہ دار تقریر کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ تعلیمی سال شروع ہو رہا ہے، ہمیں اس سال کس طرح مدرسے کے نظام اور اس کے ماتحت مختلف شعبوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے، یا پھر سال کے اختتام پر تقریر ہوتی ہے، جو طلبہ فارغ ہو کر جا رہے ہوتے ہیں، ان سے خاص طور پر خطاب ہوتا ہے کہ آپ نے جو کچھ یہاں سے حاصل کیا ہے، اس سے کیا کام آپ کو لینا ہے اور اپنے آپ کو ملک وقوم کے سامنے کس طرح پیش کرنا ہے؟ جن طلبہ کو دوسرے سال آنا ہوتا ہے ان سے یہ بتایا جاتا ہے کہ آپ اپنے خاندان، علاقے اور ماحول میں کس طرح کا نمونہ پیش کریں اور لوگوں کے اندر تاثیر پیدا کریں۔

لیکن یہ درمیان سال میں عید الاضحیٰ کی تعطیل میں اس اہتمام سے تمام طلبہ کو جمع کرنا بعض لوگوں کو عجیب لگے گا، لیکن میرے بھائیو! آپ کو اس عید الاضحیٰ کی تعطیل کے موقع سے چند باتیں کہنے کے لیے جمع کیا گیا ہے، ان ایام کی چھٹیوں سے متعلق آپ سے کہنا یہ ہے کہ آپ ایام تشریق اور ایام نحر کی چھٹی میں گھر جا رہے ہیں، یہ کوئی دسہرہ کی چھٹی نہیں ہے، حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل (علیہما الصلاۃ والسلام) کی یاد میں یہ چھٹی آپ کو دی جا رہی ہے، آپ وہاں بھی اس کا خیال رکھیں، ایام تشریق کا ایک شامیانہ تو وہ ہے جو حجاج کرام کے سروں پر ہوتا ہے، لیکن ایک شامیانہ وہ بھی ہے جو پوری امت مسلمہ کے سر پر ہوتا ہے، آپ اس شامیانہ سے دور نہیں، آپ اس کا خیال رکھیں کہ یہ دن غفلت، بے توجہی، تفریح بازی اور دوسری بے مقصد مشغولیتوں میں نہ گزریں، آپ اپنے گاؤں اور گھر میں ان

زبان وادب خدمت دین کا مؤثر ذریعہ

ادب کے راستے سے جہاد

آپ نے مغرب بعد جب اچانک اعلان سنا ہوگا کہ تعزیتی جلسہ ہوگا تو آپ کے ذہن میں یہ بات آئی ہوگی کہ کسی بلند فائق مسلمان یا کسی بڑی اسلامی دینی شخصیت کے انتقال کی خبر آئی ہے اور ان کی تعزیت میں جلسہ ہو رہا ہے، یا کوئی بہت بڑے عالم دین جو قرآن و حدیث کی تدریس یا علوم دینیہ کی تدریس میں مشغول تھے، اور جو عام طور سے اس طرح کی دینی جامعات یا مدارس میں درس دیتے تھے۔ یا کسی شیخ وقت کا انتقال ہوا ہے، اور اس سلسلہ میں جلسہ ہو رہا ہے۔ اور شاید آپ کے لیے یہ بات خلاف توقع ہو کہ ایک ممتاز ادیب، ایک مصنف وادیب اور ایک محقق ڈاکٹر عبدالرحمن رافت باشا مرحوم کے سلسلہ میں جلسہ ہو رہا ہے، وہ بھی مسجد میں ہو رہا ہے، اور علماء و طلبہ دین کے مجمع میں ہو رہا ہے۔ تو آپ کو شاید ان دونوں باتوں میں کچھ تضاد محسوس ہوا ہو، اور شاید اس سے پہلے اس کی مثالیں کم ملی ہوں کہ کسی ادبی، کسی ادیب یا شاعر، کسی صاحب قلم سے یہاں اتنے بڑے پیمانے پر جلسہ ہوا ہو، لیکن میں اس میں بالکل کسی قسم کا تضاد نہیں سمجھتا۔ میری نگاہ میں ادب کی راہ سے دین کی خدمت کرنے والوں کی بہت اہمیت ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی ایک جہاد ہے، نیت کا معاملہ تو اللہ سے ہے لیکن آدمی کے طرز تحریر سے، تکلم سے، اخلاق سے، اور خود اس کی زندگی سے اور اس کے جذبات سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی نیت میں اسلام کی خدمت تھی یا کچھ اور؟

ڈاکٹر عبدالرحمن رافت باشا نے جس کام کی ابتدا کی وہ بالکل نیا نہیں تھا۔ وہ محتاجِ

گوشوں میں مختلف زمانوں پر ہوتا رہا ہے، لیکن انھوں نے اپنی زندگی اس کے لیے وقف کردی اور اس کو وقت کا بہت بڑا جہاد اور ایک بہت بڑی دینی خدمت سمجھا۔

ادب کے اثرات

ادب کا بڑا اثر قوموں پر اور ان کی فکر پر، یہاں تک کہ ان کی سیاست پر، جو ملکوں میں انقلاب لاتے ہیں اور جو قوموں کو خاص رخ پر ڈال دیتے ہیں۔ ان پر ادب کا بڑا اثر ہوتا ہے اور ادب جس طرح ان کے ذہن کی تشکیل کرتا ہے، اور پھر ان کو موقع دیتا ہے کہ وہ قوموں کے ذہن کی تشکیل کریں، اور پوری پوری قوموں اور نسلوں کو اور ایک ہی نسل نہیں بلکہ آنے والی نسلوں کو بھی ایک خاص رخ پر ڈالنے کی کوشش کریں، اس رخ پر جس کو ان کے ذہن نے قبول کرلیا ہے اور جس سے وہ مانوس ہو گئے ہیں، اور جس کے اظہار کے لیے اور اس کو قلب و دماغ میں راسخ کرنے کے لیے ان کے پاس قلم کی طاقت اور زبان کی طاقت موجود ہے، وہ اس سے ایک عظیم الشان تعمیری اور اس کے ساتھ عظیم الشان تخریبی کام انجام دے سکتے ہیں، جو میں کہہ سکتا ہوں کہ اکثر اوقات فوج اور حکومت کے متعلق نہیں کہہ سکتا، لیکن بعض اوقات خاص علماء دین اور خاص مشن کی تحریک اور یہاں تک کہ انھی باتوں کو بھی یقینی کر سکتے۔

قوت بیانیہ کی اہمیت

اللہ تعالیٰ نے ادب میں ایک طاقت رکھی ہے، قرآن مجید کی مشہور سورہ سورۃ الرحمٰن کی ابتدائی آیتیں ہیں: الرَّحْمٰنُ، عَلَّمَ الْقُرْآنَ، خَلَقَ الْإِنْسَانَ، عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (رحمٰن خدا نے رحمان ہی ہے جس نے قرآن کی تعلیم دی، اسی نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو بیان سکھایا) بعض سے انسان کی تعریف کی گئی ہے، خاص طور پر فلسفہ نگاروں میں جو یونانی فلسفہ کے دور تک رائج رہا اور اب بھی ان کا اثر ہے، فلسفۂ یونانی میں انسان کی تعریف حیوان ناطق سے کی گئی ہے، اور قرآن مجید میں قوت بیانیہ کی قدر و قیمت و صرف تسلیم ہی نہیں کیا گیا بلکہ اس کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے، قرآن مجید میں متعدد آیتیں آپ پڑھیں گے، ان میں اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کو جو تمام چیزوں

پڑھیں گے اور اسلام کی تجدید و اصلاح کی تاریخ پڑھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس قوت بیانیہ سے، زبان کی فصاحت و بلاغت سے اور قلم کی طاقت سے کتنا بڑا کام لیا گیا۔

انقلاب فرانس میں ادب کا کردار

انقلاب فرانس دنیا کی تاریخ میں ضرب المثل ہے۔ اس انقلاب کے پیچھے آپ کو کچھ اہل قلم نظر آئیں گے۔ کچھ ادیب نظر آئیں گے جنہوں نے ذہنوں کو تیار کیا جمہوریت کے لیے، آزادی کے لیے اور بغاوت کے لیے، اور پھر ان کا اتنا اثر پڑا کہ ایک ایسی نسل تیار ہوگئی جو برداشت نہیں کر سکتی تھی اس وقت کے حالات کو، فرانس میں موجود استبداد کو، جمود کو، اور تقلید کو جو دین کے نام سے وہاں مسلط تھیں، جو وہاں کی روایات تھیں اور ان کا جو اثر تھا وہ سب ریت کا ڈھیر ثابت ہوئے۔ ان کتابوں کے ادبی شہ پاروں نے، شاعری نے جو اس دور میں پیدا ہوئی اور یہاں تک کہ ناول نگاری نے اور قصہ کہانی کی جو کتابیں لکھی گئیں اور اس کے علاوہ اور بھی (ادب کا دائرہ وسیع ہے) اس نے فرانس کو ایک ایسے مرحلہ پر پہنچا دیا کہ وہ اس انقلاب کے لیے نہ صرف تیار تھا بلکہ بے چین تھا، اور کوئی استبدادی طاقت، کوئی منطق اور دین کے نام سے کوئی دعوت اور کوئی تقدیس ان کو روک نہیں سکتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ لاوا کوہ آتش فشاں کی طرح پھوٹ پڑا اور پورا فرانس بہہ گیا، اس انقلاب فرانس کا اثر پورے یورپ پر پڑا۔ یہاں تک کہ آج تک ذہنوں پر چھایا ہے۔

زبان وقلم نے ہمیشہ تجدید کا ساتھ دیا

یہ تو سیاسی اور عوامی انقلابات کا ذکر ہے، خود آپ اسلام کی تاریخ میں دیکھیں گے (اس موقع سے فائدہ اٹھا کے کہتا ہوں) ہمیشہ زبان نے اور قلم کی طاقت نے ساتھ دیا ہے تجدید کی اور اصلاحی تحریکوں کا، اور یہ ان کا سب سے بڑا ہتھیار رہا ہے اور جہاد کا سب سے بڑا آلہ رہا ہے، اور وہ حضرات جنہوں نے حالات میں تبدیلی پیدا کر دی، ایک نظام کو ختم کر کے دوسرے نظام کو جاری کر دیا اور ذہنوں میں نئی بیداری ہی نہیں بلکہ بے چینی پیدا کر دی، وہ وہ لوگ تھے جنہوں نے قوت

ممالک عربیہ اور خاص طور پہ مصر کے بعض ادیبوں نے کی، اس پر روک لگائی اور ان کا مقابلہ کیا، اور چوں کہ مصر کا اثر تمام عرب ملکوں پر ایسے پڑتا تھا جیسا کہ پہلے ایران کا اثر پڑتا تھا مسلمانوں کی حکومت کے زمانہ میں، ہندوستان پر ولایت کا اثر پڑتا تھا انگریزوں کے دور حکومت میں، اور لفظ ولایت ہی بتاتا ہے کہ کس احترام سے یہ لفظ نکلتا تھا تو جس طرح انگلستان کا اور یورپ کا اثر پڑتا تھا اسی طرح مصر کا اثر تھا ممالک عربیہ پر، اچھے اچھے لوگ مصر کی طرف جو چیز منسوب کی جائے اس کا نام لیتے ہیں اور کسی مصری کتاب کا نام لیتے ہیں وہ گویا بالکل مسحور ہو جاتے، حضرات خاموش ہو جاتے اور اس کا جواب دینا بہت مشکل ہو جاتا تھا، ان مصری ادیبوں سے سارا عالم عربی متاثر ہو رہا تھا، اور تمام عرب تو جوانوں پر ان کا جادو چلتا تھا، الحمد للہ نے ہمارے بعض دوستوں کو اس کا مقابلہ کرنے کی توفیق دی، ان میں سب سے زیادہ جنھوں نے اس سلسلہ میں سرگرمی دکھائی اور اس کو ایک تحریک اور زندگی کا مقصد بنایا۔ اور یہ ہے اصل چیز کہ اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا اور عبادت سمجھا، وہ ہمارے مرحوم دوست ڈاکٹر عبدالرحمن رافت پاشا ہیں کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اپنی ذات سے خدمت کی اور بڑا کام کر گئے، بلکہ چوں کہ وہ شعبہ ادب کے سربراہ بھی تھے جامعۃ الامام محمد بن سعود میں، انھوں نے اس تحریک کو آگے بڑھایا اور ایک نسل تیار کی، اور انھوں نے اپنے زیر تربیت طلبہ اور نوجوانوں کی رہنمائی کی اور ان کو بجائے اس کے کہ کوئی اور موضوع دیں ادب کا موضوع دیا اور ان سے درجنوں کتابیں لکھوائیں جو ان کی تحریک پر لکھی گئیں، اور جیسا کہ ہمارے عزیز مولوی محمد رابع نے کہا کہ انھوں نے بیہودہ سلسلے تیار کیے، ایک دعوتی اور اسلامی شعر کا سلسلہ اور ایک حیاۃ الصحابہ کا سلسلہ، اور چوں کہ وہ اچھے صاحب قلم اور ادیب بھی تھے اس لیے ان کی کتابیں بہت کامیاب ہوئیں۔

بہر حال ان سے ہمارا تعارف ان آخری برسوں میں ہوا جس کی مدت بہت طویل نہیں ہے، لیکن بہت جلد ہمارے ان کے درمیان ایک ایسا رشتہ قائم ہو گیا جو صرف ادبی اور علمی رشتہ نہیں تھا، بلکہ دوستانہ اور برادرانہ رشتہ بھی تھا، میں ان کی شرافت سے بہت زیادہ متاثر ہوا، اور انھوں نے ادب اسلامی میں ندوۃ العلماء کا اور ندوۃ العلماء کے کارکنوں کا جو حصہ ہے، ان

کہ انھوں نے بڑی فراخ دلی، بلند ہمتی کی جرأت اور شرافت کے ساتھ اعتراف کیا، اور حقیقت میں اس وقت رابطہ ادب اسلامی کی جو تحریک ہے وہ ان کی ہی رہین منت ہے، انھوں نے اس کی طرف توجہ دلائی اور خود بھی وہ کوشش کرتے رہے ہیں، ایک ادارہ کی حیثیت سے اور تحریک کی حیثیت سے لینے میں ان کا بڑا دخل ہے، جب بھی ان سے ملاقات ہوتی اس موضوع پر گفتگو ہوتی تھی، وہ یہاں رابطہ ادب اسلامی کے جلسہ میں آئے، انھوں نے جلسہ کی رہنمائی کی اور بڑی اچھی قیادت کی، اس کوشش میں پیش پیش تھے، وہ اس کے بعد بھی برابر اس تحریک سے وابستہ رہے، ہندوستان کے ساتھیوں اور عزیزوں اور ان کے درمیان برابر رابطہ قائم رہا، اور ہم بڑی امیدیں رکھتے تھے کہ ان کا کام اور منتج ہوگا اور زیادہ موثر ہوگا، لیکن ان کا شب وروز کا مشغلہ اور گویا ان کا وظیفہ بھی تھا، اور ہم سمجھتے ہیں کہ انھوں نے وقت کا ایک بڑا اور دعوت کا کام بھی کہ اس کو وقت دیا، وہ بھی ایک فال نیک اور بشارت ہے کہ ان کی تعزیت کا جلسہ یہاں مسجد میں ہورہا ہے جس میں مخصوص طبقہ کے اس قدر حضرات موجود ہیں اور ایک تبلیغی جماعت موجود ہے جو بلاد عربیہ سے آئی ہے، یہ خود نیک فال ہے اور قرینہ ہے اس بات کا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ، اللہ تعالیٰ کا معاملہ ان کے ساتھ مغفرت، رحمت کا ہوگا، اور میں تو ان کا بہت قدردان ہوں، اس لئے کہ میں اس کام کی قدر و قیمت سمجھتا ہوں اور ان کے جذبہ لگن سے واقف ہوں کہ ان کو کس قدر لگن تھی، اور میں نے آپ سے ذرا تفصیل سے اس لئے بیان کیا کہ آپ کو بھی یہ کام کرنا ہے۔

ہندوستان میں زبان و ادب کی سرپرستی شروع سے علماء نے کی

دیکھئے ہمارے ہندوستان کو یہ فخر حاصل ہے، میں نے اپنی بعض تحریروں میں لکھا ہے کہ بہت سے اسلامی ملکوں کو رشتہ اسلام سے اس لئے کمزور پڑ گیا کہ علماء نے اس کی طرف زبان و ادب میں وہ قائدانہ حصہ نہیں لیا جس کا اثر پڑا کرتا ہے، اس کی شکایت کی جاسکتی ہے اور کسی حد تک مصر و شام مستثنیٰ ہے لیکن تمام عرب ملکوں کا اور مسلم ممالک کا حال یہ ہے کہ ادب کی قیادت اور زبان و ادب میں صدارت کا مقام حاصل کرنے اور رہنمائی کرنے کی طرف علماء نے پوری

توجہ نہ دی اور اس کی ذاتی اہمیت نہیں سمجھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو نئی نسل تیار ہوئی وہ ان سے ناآشنا تھی، اور اگر نا آشنا نہیں تھی تو غیر موثر تھی، وہ دینی حیثیت سے تو ان کا احترام کرتی تھی کہ ہاں مسئلہ پوچھنا ہو تو ان کے پاس جانا چاہیے، یہ صالح لوگ ہیں، لیکن وہ ان کو وہ مقام دینے کے لیے تیار نہ تھی جو ایک قائد کا مقام ہوتا ہے، مورخ دینے والے کا مقام ہوتا ہے، اس میں ہندوستان کا استثناء ہے۔ یہاں کی زبان و ادب میں سربراہی شروع سے علماء نے کی ہے، آپ کو معلوم ہے جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ یہاں ایوان ادب کے چار ستون مانے گئے ہیں، خواجہ الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی، مولوی محمد حسین آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد کہا جا سکتا ہے، یہ چاروں طبقۂ علماء سے تعلق رکھتے تھے، ان کی ساری تعلیم مدارس میں ہوئی تھی، چٹائیوں پر ہوئی تھی، پھر اس کے بعد یہ لوگ ادبی میدان میں آئے۔

پھر سید سلیمان ندوی جیسی شخصیت پیدا ہوئی جو ایک طرف تو بھوپال کے قاضی القضاۃ تھے اور حیدرآباد کے دینی مشیر تھے، اور پاکستان جانے کے بعد وہاں کے دستور بنانے والوں میں ہیں، تو دوسری طرف انجمن ترقی اردو کے اور ہندوستانی اکیڈمیوں کے بار بار صدر ہوتے ہیں، اور اردو زبان پر خاص علمی موضوعات پر (Original) مجتہدانہ اور محققانہ چیزیں پیش کرتے ہیں کہ جن کو ادب کے ہی نہیں، علم و تحقیق کے کتب خانے میں اونچی سے اونچی جگہ دی سکتی ہے، اور دینی چاہیے اور دی جا رہی ہے، یہ ایک بڑی دینی خدمت انھوں نے انجام دی۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی ذہانت کا یا ادبی قابلیت کا اظہار کیا، نہیں! بلکہ انھوں نے خالص دین کی خدمت انجام دی ہے، جب کسی ملت، کسی قوم اور ملک میں رائج زبان اور مقبول اسلوب بیان اور صحافت، تحریر اور ادب و تحقیق اور علوم دینیہ کے درمیان اور علوم دینیہ کے حاملین کے درمیان خلیج واقع ہو جائے گی، یا بیچ میں خندق واقع ہو جائے گی تو اس وقت دین اپنی بہت کچھ طاقت کھو دے گا، کم از کم نوجوانوں پر سے اس کی گرفت چھوٹ جائے گی۔

اس لیے ہمیشہ خاص طور پر ہمارے ندوۃ العلماء کے طلبہ و فضلاء کو کبھی اپنا رشتہ زبان و ادب سے ٹوٹنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے، کبھی یہ پوزیشن قبول نہیں کرنی چاہیے کہ لوگ ذہن یہ سمجھیں کہ یہ زبان و ادب سے ناواقف ہیں، اور یہ دینی مولویانہ زبان لکھتے ہیں اور کلامی اور فقہی

مسائل پر بھی ان کی تحریریں پڑھنے کے قابل ہیں، ادب وزبان کے بارے میں، زبان کی تاریخ کے بارے میں، تنقید کے بارے میں ان کو بولنے کا کوئی حق نہیں، ان کی بات میں وزن نہیں۔

ایک وصیت

یہ میں ایک وصیت کے طور پر آپ سے کہتا ہوں کہ ہمارے ندوۃ العلماء کے مدرسۂ فکر کی خصوصیت رہی ہے کہ اس نے ملک کی زبان وادب سے اپنا رابطہ ورشتہ (ٹوٹنا تو بڑی چیز ہے) کمزور نہیں ہونے دیا، دارالمصنفین کے رفقاء کی تحریر اور مولانا عبدالسلام صاحب کی تحریر، آپ دیکھیے اقبال پر بہترین جو چیزیں لکھی گئی ہیں، ان میں "اقبال کامل" ہے، اور شعراء و شاعری کی تاریخ میں اس وقت تک جو چیز کلاسیکل سمجھی جاتی ہے وہ "گل رعنا" ہے جو ندوۃ العلماء کے ناظم مولانا سید عبدالحی حسنیؒ کی تصنیف ہے، اور "شعر الہند" ہے مولانا عبدالسلام صاحب کی، پھر فارسی ادبیات پر اس وقت تک جو چیز سکۂ رائج الوقت کی حیثیت رکھتی ہے وہ "شعر العجم" ہے، "شعر العجم" پر دس تنقیدیں کی جائیں لیکن "شعر العجم" کی اہمیت آج تک کم نہیں ہوئی، اور مجھے لاہور کے ایک بڑے فاضل نے سنایا کہ "تاریخ ادبیات ایران" لکھنے والے براؤن نے ایک مرتبہ کہا کہ مجھے اردو زبان پڑھنے کی تمنا کبھی کبھی اس لیے ہوتی ہے کہ میں "شعر العجم" سے استفادہ کرسکوں، تو یہ خصوصیت اور معیار باقی رہنا چاہیے، ہم ڈاکٹر عبد الرحمن رأفت الباشا کا حق سمجھتے ہیں کہ اللہ کے گھر میں بیٹھ کر ایک نماز کے بعد اور دوسری نماز سے پہلے دونوں نمازوں کے درمیان اور خالص دینی علوم کے طلبہ کے سامنے ان کی خدمات کا اعتراف کریں، ان کے لیے دعائے خیر کریں، وہ بڑے اچھے مسلمان، بڑے شریف مسلمان، عالم، بڑے صاحب قلم، بڑے ادیب اور دین کی خدمت کرنے والے تھے، عرصہ تک ان کی یاد تازہ رہے گی، اور ان شاء اللہ ان کے جو نقوش ہیں، وہ باقی رہیں گے، اور بہت سے لوگوں کی عرصہ تک رہنمائی کریں گے۔ (۱)

---

(۱) عربی زبان کے مشہور ادیب ومصنف ڈاکٹر عبدالرحمن رأفت باشا (پروفیسر امام محمد یونیورسٹی، ریاض) کے انتقال پر دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں ۲۹ جولائی ۱۹۸۶ء کو منعقد تعزیتی جلسے میں کی گئی تقریر، یہ تقریر مولانا سید عمیر مرتضی ندوی نے قلمبند کی، ماخوذ از "تعمیر حیات" لکھنؤ (شمارہ ۲۵ اگست ۱۹۸۶ء)۔

زبان وادب سے علمائے دین کا رشتہ

زبان وادب میں مہارت کی ضرورت

ہماری تاریخ میں بعض ایسے بھی دور گزرے ہیں جن میں علوم دینیہ کے مدرسین زد سے دور رہے اور ان میں تحریک پیدا کیا لیکن انھوں نے دنیا سے کوئی ایسا رابطہ قائم نہیں رکھا جس سے تازہ ترین طریقۂ فکر اور نئی نسل کے رجحانات سے واقف ہوں، وہ صرف دین کی ترجمانی ہی کا فریضہ انجام نہ دیں بلکہ زمانہ پر اثر انداز ہوں اور اسے صحیح رخ دے سکیں۔ ان اوقات میں علماء سے عوام کا رشتہ کٹ چکا تھا، اور دونوں میں خلیج پیدا ہو گئی تھی جو جدید اور قدیم تعلیم یافتہ طبقہ کے درمیان کی نزاع آرائی کی شکل میں رونما ہوئی۔

سید صاحب نے فرمایا تھا کہ اس وقت اسلامی ملک کا حال یہ ہے کہ گاڑی میں دو گھوڑے ایک دوسرے کے مخالف سمت میں جوڑ دیے گئے ہیں، جن میں ایک جدت کی طرف اور دوسرا قدامت کی طرف کھینچ رہا ہے۔ تمام ممالک اسلامیہ میں یہی صورت حال پیش آئی، علماء اپنے حصار میں محصور ہو کر رہ گئے، علماء نے زہر کا بھی یہی حال تھا، وہ اپنے علوم میں متبحر تھے، انہیں سند کا درجہ حاصل تھی، لیکن انھوں نے اپنے کو اس چیز سے بے تعلق کر لیا تھا کہ اس زمانہ میں کون سا اسلوب پسندیدہ ہوتا ہے، زبان وادب کا کون سا طرز نوجوانوں پر اثر انداز ہوتا ہے، اور جیتی جاگتی زبان میں کس طرح خیالات ادا کیے جاتے ہیں، اس میں کس طرح دلآویزی اور ساحری پیدا کی جاتی ہے، جو دلوں کو موہ لے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان و ادب کی قیادت اس طبقہ میں چلی گئی جسے نہ تو دین کے بہت سے اصولوں سے اتفاق نہیں تھا، اس نے دینی تربیت نہیں پائی تھی، دین کے بارے میں اس کے اندر احترام کا وہ جذبہ نہیں تھا

جو ایک دینی سماجی کے بارے میں ہونا چاہیے، اور یہ تو اپنی مغربی تعلیم کی وجہ سے اور خاص طور سے نپولین کے حملہ کے بعد ایک پوری نسل ایسی پیدا ہوئی جس نے یورپ کا رخ کیا، خصوصاً فرانس کا اور فرانس کا مزاج برطانیہ کے یا دوسرے مغربی ممالک کے مزاج سے مختلف ہے، اس میں زبان کی آزادی اور فکری آوارگی پائی جاتی ہے۔

تو جب یہ نسل اپنے علاقوں میں لوٹی تو اس نے ایک لٹریچر تیار کیا جو زبان کی شگفتگی اور مغربی چیزوں سے واقفیت اور مستشرقین کے خیالات کی نمائندگی کی وجہ سے بہت زیادہ اثر انداز ہوا، اور اسی کے ساتھ بعض عرب مصنفین نے مستشرقین کے خیالات کو اپنے الفاظ میں پیش کیا، جیسے مارگولیس کی کتاب کا چربہ طہ حسین نے "الشعر العربی" کے عنوان سے پیش کیا، اور بعض ناقدین نے مقابلہ کر کے دکھایا ہے کہ جو طہ حسین نے لکھا ہے، وہ ایک مغربی مصنف کے خیالات لے لیے ہیں اور انہیں عربی زبان میں شگفتہ اسلوب میں منتقل کر دیا ہے۔

اسی طرح "المرأۃ المصریۃ" کتاب لکھی گئی، اس میں سراسر بے حجابی اور عورت کی آزادی کی دعوت دی گئی جو مغربی خیالات و تصورات کا نتیجہ تھی، اسی طرح اور بہت سی کتابیں لکھی گئیں جس سے اس موضوع کا پورا لٹریچر تیار ہو گیا، ادھر علماء اپنے محدود حصار میں تھے، وہ اس میں نحوی غلطیاں نکالتے تھے اور زبان کی نکتہ چینی کرتے تھے، اس لیے یہ ادب یا تھوڑا سا ڈر رہتے تھے، لیکن علماء نے اس کا مثبت اور متبادل حل نہیں پیش کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جدید نسل بالکل آزاد ہو گئی اور زبان و ادب اور آزاد خیالی دونوں لازم و ملزوم چیز ہو گئے۔

پھر زبان و ادب اور آزادانہ طریقۂ فکر نے اسلامی اصولوں، اسلامی مسلمات، اور اسلامی نظام معاشرت کے سلسلہ میں ایک متشکک طبقہ پیدا کر دیا، یہ صورت حال بڑی خطرناک تھی، چنانچہ جب بھی اس طبقہ کے ہاتھ میں کوئی قیادت آ گئی، وزارت تعلیم آ گئی، یا اسی طرح وزارت تربیت، وزارت اعلام آ گئی، تو اس کے اثرات پورے مصری معاشرہ پر پڑے، اور مصر کو چونکہ قیادت کا درجہ حاصل تھا، اس لیے پورے عالم عربی اور پورے عالم اسلام پر اس کا اثر پڑ رہا تھا، اور ہمارے طالب علمی کے زمانہ میں جب مولانا مسعود عالم

ندوی، مولانا ناظم صاحب ندوی وغیرہ پڑھتے تھے، تو مصر سے جو نئی مطبوعات اور کتابیں آ تی تھیں، ان سے معلوم ہوتا تھا کہ مصر میں دین کے خلاف کھل کر محاذ آرائی قائم ہوگئی ہے، اس کا اثر جدید فرقہ پر بہت ہی انتشار انگیز ہوا، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں کے علماء نے دین نے زبان و ادب کو اپنے مقام سے فروتر سمجھا اور اس پر اپنا اثر و رسوخ اور اس حلقہ میں اپنے احترام کا تصور قائم نہیں کیا، جس کے نتیجہ میں یہ صورت حال پیش آ ئی۔

ہندوستانی مسلمانوں کی ایک خوش قسمتی

خدا کے فضل سے ہندوستان میں یہ صورت حال پیش نہیں آئی، جیسا کہ میں نے رابطہ ادب اسلامی کے جلسوں میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ یہاں کے علماء نے کسی دور میں بھی زبان و ادب سے اپنے کو غیر متعلق اور بیگانہ نہ ہونے دیا، انھوں نے ایسا نظام تعلیم بنا دیا جس نے پڑھے لکھے طبقہ کو پیدا کیا، اس میں دین اور زبان و ادب دونوں ملے ہوئے تھے، اس وقت کا نصاب اٹھا کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ علماء نصاب کی کتابوں کے ذریعہ زبان کی ضروری چیزوں سے واقف ہو جاتے تھے۔

میں آپ کو ایک مثال دوں، دہلی میں مشاعرہ ہونے والا تھا، استاذ ذوقؔ نے شاہ نصیرؔ کی غزل پر غزل کہی اور شاہ نصیرؔ کو دکھائی، شاہ نصیرؔ نے دیکھا تو اس میں ہمسری اور مقابلہ کی کوشش تھی، تو شاہ نصیرؔ نے ایسا طرز اختیار کیا کہ استاذ ذوقؔ کو شبہ ہوگیا کہ اس میں خامیاں تو نہیں ہیں، تو انھوں نے اسے شاہ عبد العزیزؒ کے پاس بھیجی کہ حضرت فرمائیں کہ اس میں کچھ خامیاں تو نہیں ہیں، شاہ صاحب نے دیکھا اور یہ کہہ کر بھیج دیا کہ بے تکلف اطمینان کے ساتھ یہ غزل پڑھی جائے، شاہ عبد العزیزؒ کا یہ کہہ دینا کافی تھا، اور اس کے بعد ضرورت نہیں سمجھی گئی کہ کسی اور کو دکھائی جائے۔ آپ خیال کیجیے کہ استاذ ذوقؔ جو بادشاہ کے بھی استاد ہیں، اور صاحب "آب حیات" کے استاد ہیں، اور کتنے استادوں کے استاد ہیں، اور شاہ نصیر اپنے زمانہ کے استاد ہیں، لیکن صرف ایک خالص عالم دین، محدث وقت، فقیہ دوراں کے محاکمہ پر اطمینان کر لیتے ہیں، یہ خوش قسمتی تھی یہاں کے مسلمانوں کی کہ یہاں کے علماء نے

دینی زبان وادب اور شاعری کے جدید اسلوب سے الگ تھلگ ہوگئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ
نئی نسل اس خطرہ سے بچ گئی جس سے دوسری نسلیں دوچار ہوئیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ نثر اردو کے چار ستون مانے ہوئے علماء ہیں، یعنی علامہ شبلی،
مولانا محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا حالی۔ یہ سب طبقۂ علماء سے ہیں، جنھوں نے
قدیم نصاب کی کتابیں پڑھیں اور ضروری حد تک دینی ادب وعلوم سے واقف تھے۔

"الاصلاح" کا دائرۂ عمل

میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ "الاصلاح" کا دائرۂ عمل صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ تقریر
تحریر میں حصہ لیا جائے، مقالوں میں حصہ لیا جائے، بلکہ اس سے بڑھ کر بیش قیمت کام یہ ہے کہ
ملک کی زبان وادب سے ایسا تعلق پیدا کیا جائے کہ دین کے تعارف کا موقع آئے اور ہر جگہ سر
ہونے دیا جائے، اور دین کو ایسی زبان اور ایسے اسلوب میں پیش کیا جائے کہ ادبی ذوق
رکھنے والا بھی نہ صرف یہ کہ اس کو پڑھنے پر آمادہ ہو، بلکہ اس کو اس میں ایسی کشش محسوس ہو، اس کا
ادبی ذوق اور ادبی حاسہ اس سے غذا حاصل کرے، تو "الاصلاح" کو میں مقرروں اور لکھنے
والوں کی ایک متوسط درجہ کی جماعت تیار کرنے کا ادارہ نہیں سمجھتا، بلکہ ہم اس سے یہ توقع رکھتے
ہیں، ہمارے علماء ملک کی زبان وادب کے جدید اسلوب سے واقف ہوں، زبان وادب سے
ہمارا رشتہ ٹوٹنے نہ پائے اور صرف ٹوٹنے ہی نہ پائے، بلکہ زبان وادب ہماری ضرورت محسوس
کرے اور ہم سے رہنمائی حاصل کرے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج سے پچاس برس پہلے
انجمن ترقی اردو کا جلسہ ہو یا کوئی ادبی مجلس ہو، اس بات پر فخر محسوس کیا جاتا تھا کہ اس میں سید
سلیمان ندوی شریک ہوں یا مقالہ پڑھیں، یا مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی اس کی صدارت
کریں اور اس میں شرکت فرمائیں، آپ دیکھیے کہ "گل رعنا" جو ہمارے والد مولانا عبد الحی
صاحب مرحوم کی تصنیف ہے، اور جو "آب حیات" کے بعد اردو شاعری کی تاریخ میں
قابل قدر کتاب سمجھی جاتی ہے، اور جس نے "آب حیات" کی غلطیوں کو پردہ فاش کیا، ایک عالم
دین کی لکھی ہوئی ہے جو خالص قدیم نصاب کی تعلیم کا فاضل تھا۔

اپنے کو زبان وادب سے بیگانہ نہ ہونے دیں

میں خاص طور سے دار العلوم کے فرزندوں سے کہوں گا کہ وہ اپنے کو زبان وادب سے بیگانہ نہ ہونے دیں، اور قلم میں ایسی شگفتگی اور طاقت پیدا کریں کہ جدید طبقہ کو مجبور کر دیں کہ وہ ان کی چیزیں پڑھیں، اور یہ نہ سمجھیں کہ ہم دینیات کی کتاب پڑھ رہے ہیں، یا اس وقت ایک خشک کام کر رہے ہیں، بلکہ وہ ان کے ادبی ذوق کا ساتھ دے، ہمارا مطالعہ وسیع ہو۔

سید صاحب فرمایا کرتے تھے ایک صفحہ لکھنے کے لیے سو صفحہ پڑھنے کی ضرورت ہے، وہ کہتے تھے کہ کہا جاتا ہے کہ فلاں پڑھے لکھے آدمی ہیں، حالانکہ ہونا یہ ہے کہ پڑھے کم اور لکھے زیادہ ہوتے ہیں، اس وقت لکھنے والے زیادہ اور پڑھنے والے کم ہیں، قلم اٹھاتے ہیں اور لکھنا شروع کر دیتے ہیں، اس کے پیچھے کوئی مطالعہ نہیں ہوتا۔

تو ندوی شعار ہے پڑھ کر لکھنا، لکھ کر پڑھنا نہیں کہ آپ خود ہی لکھیں اور پھر اسی کو پڑھیں، تو پہلی چیز ہے پڑھ کر لکھنا۔

اور دوسری خصوصیت ہے قلم کی شرافت، آپ کا قلم مہذب ہو، شریف ہو، آپ تنقید بھی کریں تو مہذب انداز میں، عامیانہ انداز نہ ہو۔

پھر ایک بات اور یہ کہ کتابیں ترتیب سے پڑھیں، ترتیب سے پڑھنے سے پڑھنے کا ذوق پیدا ہوگا، اور آہستہ آہستہ صلاحیت بڑھے گی، مطالعہ ایک فن ہے اور ایک ذمہ داری ہے، اس سلسلہ میں اپنے اساتذہ سے مشورہ کریں اور مطالعہ کا طریقہ معلوم کریں، بعض اوقات غلط مطالعہ ایک اچھے خاصے آدمی کو الحاد کے مرحلہ تک پہنچا دیتا ہے۔[1]

---

(۱) ۶ ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ کو دار العلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں جمعیۃ الاصلاح کے افتتاحی جلسہ میں کی گئی تقریر، ماخوذ از "تعمیر حیات" لکھنؤ۔ (شمارہ ۱۰/ اگست ۱۹۸۸ء)۔

علمی طبقہ کو متاثر کرنے کی صلاحیت پیدا کیجیے!

"الاصلاح" سے متعلق ضروری باتیں شروع میں کی جاتی ہیں، اس موقع پر ایک بات ذکر کرتا ہوں، "الاصلاح" کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے پڑھے لکھے طبقہ کو مطمئن کرنا۔ اس وقت مسلمانوں کے خلاف مشترکہ ایک عنوان قائم ہے، بنیاد پرست (Fundamentalist) جن کا زمانہ گزر چکا ہے، ان کو دین کے آئیڈیل اور اخلاق، قیم (Values) کہے گئے۔

آج کل پوری زندگی میں انھیں اصول وضوابط کی پابندی نہ ہونے کی وجہ سے تشدد ہے، انتشار ہے، اس لیے کہ جب کوئی اصول اور حد متعین نہیں ہے، جو دل میں آتا ہے کرتے ہیں۔

آج کا جیتا جاگتا مسئلہ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کو جو اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور اہلیت رکھتا ہے، اس کو ایمان بالغیب، قرآن، حدیث اور سلف صالحین کی تحقیقات پر اطمینان کرانا ضروری ہے۔

Fundamentalism کی اصطلاح کے خلاف مقابلہ کے لیے آپ کو پوری تیاری کرنی ہوگی۔ سب سے پہلے تو عقائد صحیح ہوں۔ مطالعہ راسخ ہو، اور چیزوں کو پیش کرنے کا صحیح طریقہ ہو، جس سے وہ متاثر ہوں۔

آج کل کی خرابی ہی یہ ہے کہ حد سوال ہیں نہ ضوابط، اصول وضوابط پر قائم رہنا دانشمندی و عقلمندی کی بات ہے، ہم کو فخر سے کہنا چاہیے کہ ہم Fundamentalist ہیں۔

اب آخر میں ایک بات پھر کہتا ہوں، آپ کے اندر ایسی صلاحیت ہونی چاہیے کہ علمی طبقہ کو متاثر کرسکیں، اور جو اقتدار پر آرہا ہو، اس کو مؤثر ذریعہ سے تحریر وزبان کے ذریعہ سے یہ سمجھا سکیں کہ اسلام کے اصول وضوابط پر عمل پیرا ہونے میں ہی فلاح وکامیابی ہے، یہ اصل

مقصد ہے "الاصلاح" کا۔

دوسرے یہ کہ آپ علامہ شبلی نعمانیؒ اور سید الطائفہ سید سلیمان ندویؒ اور دوسرے ندویوں کی تحریر سے واقف ہوں، اور ان کی کتابوں کی حفاظت کریں۔

اور آپ کو جو کتابیں انعام میں ملی ہیں، ان کا انتخاب عمدہ ہے، ان کو حفاظت سے رکھیں، آپ کو ان سے اپنے ساتھی اور یہ دارالعلوم یاد آئے گا، اور ممکن ہے جن کے ہاتھوں سے مل رہے ہیں، وہ بھی یاد آئیں، میں مبارکباد دیتا ہوں ان تمام فائزین کو جنھوں نے اپنے آپ کو انعام کا مستحق قرار دیا اور انعام حاصل کیا۔[1]

---

(۱) جمعیۃ الاصلاح، دارالعلوم ندوۃ العلماء، کے ایک جلسۂ تقسیم انعامات میں کی گئی تقریر کا خلاصہ، ماخوذ از "تعمیر حیات" لکھنؤ (شمارہ ۲۵؍مارچ و ۱۰؍اپریل ۱۹۹۳ء)۔

بھائی یوسف کو حسد میں، ایک نفسانیت کے اثر سے کنویں میں ڈال دیا تھا، اور پھر اس کے بعد کیا انجام ہوا؟ اس کی ان کو خبر نہیں تھی، یا اگر معلوم ہوا ہو کہ قافلہ آیا اور اس قافلہ نے ان کو وہاں سے نکالا، تو اس کے بعد یوسف (علیہ السلام) جس مقام تک پہنچے، اس مقام کا تصور، اس مقام کا تخیل بھی بڑے سے بڑا بلند خیال اور بڑے سے بڑا غیر اضافات کو سوچنے والا بھی نہیں کر سکتا کہ جس کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے کنویں میں ڈالا تھا، وہ اس وقت اس سلطنت پر اس درجہ قدرت پر بیٹھا ہوا ہے، اور ہم اس سے مدد لینے آئے ہیں کہ آپ ہمیں کچھ غلہ لوا دیجئے، ہماری مدد کیجئے، ہم بڑی تنگی سے دور سے گزر رہے ہیں۔ تو کنویں کی گہرائی، کنویں کی نیچے کی تہہ اور اس تخت کی بلندی، ان دونوں میں جو تفاوت ہے، جو فاصلہ ہے، وہ فاصلہ میلوں کا فاصلہ نہیں ہے، وہ فاصلہ ایک شہر سے دوسرے شہر کا فاصلہ نہیں ہے، وہ فاصلہ موت اور زندگی کا فاصلہ ہے، وہ جگہ تھی کہ جس کے متعلق ہر طرح یقین کیا جا سکتا تھا کہ وہاں سے وہ جس کو ڈالا گیا وہ نکل نہیں سکتا، اور نکلا تو معلوم نہیں کیا اس کو پھر یقینا نصیب ہوگا، اور اس کا کیا حشر ہوگا؟

تو اس پورے فاصلے کے طے کرنے کی اور اس عزت کے ساتھ، اعزاز خداوندی کے ساتھ، اور اجتبائے خداوندی کے ساتھ، اللہ تعالیٰ کی تکریم اور اللہ تعالیٰ کی قدردانی کے ساتھ، اس فاصلہ کو کامیابی کے ساتھ۔ کامیابی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی مدد کے ساتھ طے کر کے اس کنویں کی تہہ سے نکل کر اس وقت کی دنیا کی متمدن ترین اور وسیع ترین سلطنت کے ایک تخت وزارت پر اور مرکزی وزارت پر بیٹھنے کا یہ سارا جو سفر طے ہوا ہے، حضرت یوسف (علیہ السلام) نے اس کی وجہ جو بتائی ہے وہ ﴿إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾ یہ صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ کہ پیغمبر کا مقام ہے، کوئی دوسرا ہوتا تو صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو جاتا کہ میں یوسف ہوں، کیا تم نے مجھے پہچانا نہیں؟ میں وہی ہوں جس کو تم نے کنویں میں ڈالا تھا، نہیں! انا یوسف کہنے کے بعد کہتے ہیں کہ یہ بات صرف اتنی نہیں کہ میں یعقوب کا بیٹا ہوں، ﴿إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾ دو چیزیں ہیں: تقویٰ اور صبر، محظورات سے بچنا، احتیاط سے کام لینا، نفس پر قابو رکھنا، اور اس کے تقاضوں اور اس کی خواہشات کو مغلوب کرنا، اور اس پر قابو پا لینا، اور صبر سے کام لینا۔

میں اور بغیر کسی شعور کے کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہے، یہ ہمارے قرآن و حدیث سے، پوری دینی تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے کہ نیت اور شعور کو بہت بڑا دخل ہے، اور یہ وہ حقیقت ہے جس سے اس زمانہ میں بہت غفلت ہو گئی ہے، اچھے سے اچھے کام کیے جاتے ہیں، یہاں تک کہ یہ اللہ معاف کرے، یہاں تک شبہ ہوتا ہے بعض لوگوں کے متعلق کہ شاید وہ حج بھی کرآتے ہوں، اور عمرے بھی کر لیتے ہوں، اور حجاز اور دیار مقدسہ جانے والے تو خیر بہت ہیں، لیکن شعور نہیں، نیت نہیں، اللہ کی رضا کی نیت نہیں ہے، ایمان و احتساب نہیں ہے۔ ملازمتوں کے لیے جاتے ہیں، وہاں سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے جاتے ہیں، وہاں سے وہ چیزیں جو یہاں نہیں ملتیں آسانی سے ان کو لانے کے لیے، میں نام نہیں لینا چاہتا، اس مجلس میں اور اس مسجد میں ان کا نام لینا بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا، ان چیزوں کو لانے کے لیے وہ جاتے ہیں۔

ایک پہلی بات تو یہ ہے کہ میں آپ کا شعور بیدار کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے وہ عزیز، ابھی جن کی تعلیم کی تکمیل نہیں ہوئی، اللہ نے ان کی مدد فرمائی، ان کے والدین کو توفیق دی یا ان کے ذمہ داروں کو، یا براہ راست ان کو توفیق دی کہ وہ آئیں اور وہ اس پر شکر کریں، اور کوئی بڑی بات نہیں ہے کہ اس پر دو رکعت شکرانہ کی نماز پڑھیں، کہ اللہ! تیرا ہزار ہزار شکر ہے کہ تو نے ہمیں یہاں پھر آنے کے قابل بنایا، اور توفیق دی، معلوم نہیں نوکری کرنے لگتے، دکان کھول لیتے، کسی دوسرے ملک میں چلے جاتے۔

یہ بھی ایک سلسلہ چل پڑا ہے، کہ کسی عرب ملک میں چلے جاتے ہیں چھوٹی موٹی نوکری کے لیے، کہیں بھی تھانے میں جگہ مل جائے، چنگی میں جگہ مل جائے، کہیں جگہ مل جائے، اس سے بحث نہیں کہ ہم نے کیا مضامین پڑھے تھے، ہم نے کتاب و سنت کا علم حاصل کیا تھا، ہمیں معلوم ہے، ہمارے کتنے عزیز دوست ہیں یہاں کے پڑھے ہوئے ہیں، اور دوسرے مدارس کے پڑھے ہوئے ہیں، کہ وہ خلیج میں جا کر ایسے محکموں میں ملازم ہیں کہ جہاں داڑھی رکھنے کے متعلق بھی ان کو ہدایت ہے کہ داڑھی یہاں رکھنا مشکل ہے، اور جہاں ان کو بال بڑھانے پڑتے ہیں، اور معلوم نہیں کن کن چیزوں کو اختیار کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ انھوں نے ہم سے

ایک واقعہ

ہم نے آپ کو بتایا ہے کہ ہماری یہاں کلاس سے تقریر ہوئی، بہت شوق سے سنی گئی، جب ریڈیو کا کام ہوا، اب ہوا ہماری یہ تقریر یہاں ریکارڈ کرلی گئی، ہم ایک بڑے شہر پشاور چلے گئے، افغانستان کی سرحد قریب تک ہم کو جانا تھا، تو وہاں کوئٹہ میں رمضان کی پہلی یا دوسری تاریخ پڑ گئی، تو وہاں کے ایک بڑے افسر نے جو ہندوستانی تھے، انھوں نے ہماری افطار کی دعوت کی، وہ تقریر سن کر آرہے تھے، انھوں نے کہا مولانا! آپ کی تقریر سن کر ہم آرہے ہیں، بہت خوب تقریر کی اور آپ نے بڑی ضروری باتیں کہیں، ایک بات آپ نے نہیں کہی کہ افطار کرنے میں جو مزہ آتا ہے، وہ کسی چیز میں مزہ نہیں آتا، میں تو روزہ رکھتا ہی اسی لیے ہوں، میں تو روزہ ہی اس لیے رکھتا ہوں کہ افطار میں جو مزہ آتا ہے، اس وقت پانی پینے میں، یا کھانے میں جو مزہ آتا ہے، وہ کسی چیز میں نہیں آتا، تو صاف ان سے کہہ دیا، حالانکہ ان کے دوستوں نے بتایا کہ یہ ملحد (Atheist) ہیں، پھر بھی یہ روزہ رکھتے ہیں۔

تو معلوم ہوا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ روزہ رکھا جائے اور نیت نہ ہو، مگر یہ بات نہیں ہونی چاہیے، جو اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے مامور ہے، اور وہ نیت ہے اس کی رضامندی کی جو روح ہے، پھر "من قام لیلة القدر ایمانا واحتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه" شب قدر میں بغیر ایمان و احتساب کے لوگ اٹھتے ہیں، لیکن جاگتے ہیں، ایسے آپ تلاش کریں تو آپ کو ایسے لوگ مل جائیں گے کہ جن کی سرے سے کوئی نیت ہی نہیں ہوتی، سب لوگ اٹھے تھے ہم بھی اٹھ گئے، یا کوئی تکلیف تھی، یا نیند نہیں آرہی تھی، یا اس کے علاوہ کوئی بات ہے کہ لوگ کہیں کہ یہ بھی بڑے شب بیدار ہیں۔

تو اس سے ایک بات تو یہ ہے کہ جو یہاں پہنچے سے پڑھ رہے تھے، اور اللہ تعالیٰ ان کو دینی تعلیم کی تکمیل اور اس کا فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے، ان سے بھی ہم یہ کہیں گے کہ اس پر شکر کریں، اور اس کو غنیمت سمجھیں، شکر کریں کہ کوئی مانع پیش نہیں آیا، اللہ تعالیٰ نے ہم کو یہاں بھیجا، تو ان کے لیے تعلیمی اشتغال و مطالعہ میں ایک برکت ہوگی، اور تاکید ہوتی کہ

شعور کے ساتھ وہ شروع ہوا ہے اور نیت کے ساتھ شروع ہوا ہے۔

اور ہمارے جو عزیز بھائی پہلی مرتبہ آئے ہیں، ان سے تو ہم یہ کہیں گے کہ ان کو تو بہت ذہن کو حاضر کر کے نماز شکرانہ پڑھنی چاہیے، دو رکعت کم سے کم پڑھیں، اور اللہ کا شکر کریں کہ بالکل ممکن تھا کہ ہم کو کسی اسکول میں بھیج دیا جاتا، کسی انگلش میڈیم اسکول میں بھیج دیا جاتا، کسی ہندی اسکول میں بھیج دیا جاتا، کسی کام پر لگا دیا جاتا، کوئی پیشہ سیکھنے کے لیے ہمیں کہیں بٹھا دیا جاتا، اور کچھ نہ ہوتا تو کوئی بیماری مانع بن جاتی، یا ماں باپ کی محبت مانع بن جاتی، سب ہو سکتا تھا، اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہاں آنے کی توفیق دی، اس پر استحضار ہونا چاہیے، ذہن کو حاضر کرنا چاہیے، تو اس سے بہت بڑا فرق ہوگا، تو ان سے تو یہ کہ اس پر اللہ کا شکر ادا کریں، زبان سے الحمد للہ اس نیت کے ساتھ کہیں، دل کی گہرائی سے الحمد للہ کہیں، اور انجام کو سوچیں کہ اگر ہم اور کسی لائن میں جاتے تو کیا انجام ہوتا؟ کہ ہم کو صحیح عقائد کا بھی علم نہ ہوتا، اور عقائد کا علم ہوتا تو ان عقائد پر ہمارا کوئی ایمان و عقیدہ نہ ہوتا، ہم کو فرائض کا علم نہ ہوتا، ہم کو اپنے پڑوسیوں، عزیزوں کی عاقبت کی فکر نہ ہوتی، ہم کو ملک میں جو حال ہو رہا ہے، جس خطرہ میں یہ ملک مبتلا ہو رہا ہے، اور اس کا سامنا کرنے جا رہا ہے، اور جو یہاں اسلام کا بظاہر انجام نظر آتا ہے، کہ کہیں یہ ملک اسپین تو نہیں بن جاتا، ہمیں ان باتوں میں سے کسی چیز کی پرواہ نہ ہوتی، بلکہ ممکن ہے کہ ہم اسی مخالف لشکر میں، اسی مخالف محاذ میں ہم شریک ہوتے، تو اس کو، ذہن کو حاضر کر کے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے، اس سے فرق پڑے گا ان شاء اللہ آپ کے پڑھنے میں، آپ کے فہم میں، اور استفادہ میں اور اس وقت کے انتفاع میں بھی اور آئندہ بھی اس سے کام لینے میں فرق پڑے گا، ایک بات تو یہ کہتا ہوں۔

اخلاص اور اختصاص

اب اس کے بعد یہ کہتا ہوں کہ میں نے بہت دنوں سے ایک عنوان بنایا، بہت سے مدارس میں خطاب کرنے کا موقع ملتا ہے، تو میں کہا کرتا ہوں کہ ہمارے دینی مدارس کے طلبہ کو دو چیزوں کی ضرورت ہے: اخلاص۔ اختصاص۔

ایک تو اخلاص ہو کہ ہم اللہ کی رضا کے لیے، اللہ کے احکام ومنشا کو معلوم کرنے کے لیے، اور ضلالت سے بچنے کے لیے، اور قیامت کے خطرات سے، عذاب جہنم اور دوسرے اھوال سے بچنے کے لیے ہم یہ علم پڑھ رہے ہیں۔

اور دوسری یہ کہ اختصاص ہو، یعنی آپ استعداد پیدا کریں اور آپ کسی ایک علم کو اپنا خاص موضوع، مرکزی موضوع بنا کر محنت کریں۔

سب علوم ہیں، اور یہ ہمارا نظام تعلیم جو ہے، قدیم دینی تعلیم، اس میں علوم میں باہمی تعاون بھی ہے، اور ایک کا دوسرے پر انحصار بھی ہے، اور یہ علوم ایک دوسرے کے معاون بھی ہیں، تو اس لیے یہاں یہ تفریق نہیں ہے کہ اگر ادب ہے تو دین نہیں، اور دین ہے تو ادب نہیں، اور ادب ہے تو فلاں، نثر ہے تو نظم نہیں، نظم ہے تو نثر نہیں، یہ سب کچھ نہیں، تو یہ پورا ایک مجموعہ، پورا اجتماعی نظام جو ہے دینی تعلیم کا، اس میں ان سب میں ہم مشارکت پیدا کریں گے، اور ان کا علم ہم حاصل کریں گے، ان پر قدرت حاصل کرنے کی کوشش کریں گے، اس موضوع کی کتابوں سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت پیدا کریں گے، اور بلکہ اس میں صاحب تصنیف اور صاحب تعلیم اور صاحب توجیہ بننے کی کوشش کریں گے، لیکن کسی ایک فن کو اپنا خاص موضوع بنائیں گے، اور اس میں اختصاص پیدا کریں گے۔

تو ہم کہا کرتے ہیں کہ اخلاص و اختصاص، یہ دو چیزیں ہمارے مدارس کے لیے دو بڑے عنوان ہیں، کہ تمام علوم کے بارے میں تو اخلاص کا معاملہ، پورے نظام تعلیم کے بارے میں اخلاص کا معاملہ، اللہ کی رضا کے لیے ہم پڑھ رہے ہیں، اسلام کے احکام کو، اسلام کی تعلیمات کو سمجھنے کے لیے، اور اس کو جذب کر لینے کے لیے، اور اس پر اپنے ایمان کو علی وجہ البصیرۃ قائم کرنے کے لیے، پھر اس کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے ہم یہ پڑھ رہے ہیں، نہ ہمیں نوکری مقصود ہے، نہ عزت مقصود ہے، نہ دولت مقصود ہے، اللہ دے دے اور وہ بھی اگر کسی درجہ میں جا کر ضروری بھی ہو تو اس کے لیے کوشش کرنا بھی کوئی حرام نہیں ہے، لیکن مقصود اصلی یہ نہیں ہے۔

فقہ کی طرف امتیازی توجہ کی ضرورت

تو ایک تو اخلاص ہو، اور دوسرے اختصاص ہو، کسی موضوع کو اپنا مخصوص، اختصاصی موضوع بنا کر اس میں کوشش کرنا، تفسیر کو لے لیجیے، حدیث کو لیجیے، اور فقہ کے متعلق آج کل یہ خیال بار بار میرے ذہن میں آتا ہے کہ ہمارے دار العلوم میں فقہ کی طرف جتنی توجہ ہونی چاہیے، اتنی توجہ نہیں ہے، اور کچھ شروع سے ایسی روایت چلی آرہی ہے کہ جو استحضار ہونا چاہیے اور تحقیق ہونی چاہیے، مسائل پر نظر ہونی چاہیے، اور افتاء کی جو صلاحیت ہونی چاہیے، اس کی کمی ہے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ کی ایک وصیت

تو اس کو میں کل یا پرسوں بھی کسی موقع سے بیان کر رہا تھا، ہمارے اور آپ کے سب کے استاد مخدوم، فخر زمانہ اور فخر ہندوستان اور فخر عالم اسلام حضرت علامہ سید سلیمان ندوی (رحمۃ اللہ علیہ) یہاں ڈھاکہ سے تشریف لائے، وہ بہت دل شکستہ تھے، ان کے ساتھ یونیورسٹی میں ایک بہت نامناسب واقعہ پیش آیا تھا، ہماری یہاں ٹھہرے، آخر میں ہماری یہاں، ہمارے بڑے بھائی صاحب کے پاس ٹھہرتے تھے، تو دیکھا کہ مسکراہٹ آتی ہی نہیں تھی ان کے لبوں پر، اور ایک حزن کی کیفیت ان کے چہرے پر طاری تھی، تو وہ ہمارا بہت خیال کرتے تھے، اس لیے کہ والد صاحب کے شاگرد بھی تھے، اور ان کے زمانہ نظامت میں اور ان کے زمانہ ذمہ داری میں انھوں نے یہاں تعلیم حاصل کی تھی، تو میں نے عرض کیا ان سے کہ سید صاحب! آپ کا طلبہ سے کوئی خطاب ہو جانا چاہیے، انھوں نے ایک، دو مرتبہ تو مناسب الفاظ میں ٹال دیا کہ نہیں، پھر میں نے دو تین مرتبہ کہا تو کہا: اچھا، یہیں اسی مسجد میں ان کا خطاب ہوا، اور انھوں نے فرمایا کہ فقہ کی طرف توجہ کرنے کی بڑی ضرورت ہے۔

انھوں نے جب ندوۃ العلماء چھوڑا، تو وہ بھوپال گئے تھے، اور دار القضاء کے وہ نگران اعلی اور گویا سب سے بڑے قاضی اور اس کے صدر تھے، ان کو بہت تجربہ ہوا، پھر جب وہ پاکستان گئے تو ان کو اور مزید تجربہ ہوا، تو یہ بات انھوں نے فرمائی، اور گویا یہ ان کی وصیتوں

فن سے ایک وحشت ہے، لیکن اس کے بعد تو ان کو یہاں تشریف لانے کی نوبت آئی، اور نہ خطاب کرنے کی۔

آپ کو سب سے زیادہ فقہ سے واسطہ پڑے گا

تو ایک بات تو یہ آپ سے کہتے ہیں کہ آپ کو سب سے زیادہ جس چیز سے واسطہ پڑے گا وہ فقہ کا علم ہے، کیونکہ آپ جب کسی گاؤں میں جائیں گے، کسی محلہ میں پہنچ جائیں گے، وہاں کوئی نہ کوئی مسئلہ پیش آئے گا کہ کوئی آپ سے مسئلہ پوچھنے آئیں گے کہ صاحب! نماز میں یہ غلطی ہوگئی، یا سجدہ سہو کرنا چاہیے تھا؟ یا دوبارہ نماز پڑھنی چاہیے؟ یہ نماز صحیح ہوئی؟ اور کوئی زکوٰۃ کا مسئلہ پوچھے گا، کوئی میراث کے متعلق مسئلہ پوچھے گا، اور کوئی طہارت وغیرہ کے متعلق پوچھ سکتا ہے۔

تو ایک بات تو آپ سے یہ کہنا ہے کہ فقہ کی طرف آپ ایک امتیازی توجہ کریں، اور اب ماشاء اللہ یہاں دار القضاء بھی قائم ہوگیا ہے، اور وہاں تربیت کا بھی کوئی نظام ہوگا، اور وہاں مقدمات بھی آتے ہیں تو اس سے آپ مناسبت پیدا کریں، یہ مناسبت ہمارے یہاں بہت کم ہوئی۔

علوم قرآن میں اختصاص

پھر اس کے بعد قرآن مجید ہے، قرآن مجید کا اعجاز، قرآن مجید کا اس زندگی پر انطباق، اور قرآن مجید سے مسائل کا جو اس وقت پوری نسل انسانی کو اور ہمارے ملک کو درپیش ہیں حل ہوتے ہیں، اور قرآن مجید ہی دنیا اور آخرت میں ایک کامیاب زندگی کا ضامن ہے، اور پھر اس کا معجزانہ اسلوب اور ایک ایک لفظ کا معجزہ ہونا، اور اس کی پیشین گوئیاں اور اس کی اخلاقی تعلیمات، ان ساری چیزوں سے آپ کو ایک زندہ مضمون کی طرح، ایک آثاری مضمون کی طرح نہیں، بلکہ ایک زندہ حیاتی مضمون کی طرح، حیوی مضمون کی طرح اور ایک عملی مضمون کی طرح آپ کی توجہ ہونی چاہیے۔ اللہ کے فضل سے، ماشاء اللہ آپ کو ایسے استاد بھی عطا کیے

ہیں جو آپ کی اس میں مدد کر سکتے ہیں، اور آپ کو روشنی دے سکتے ہیں۔

فنِ حدیث میں اختصاص پیدا کریں

پھر اس کے بعد حدیث کا فن ہے، حدیث کے فن کو بہت تیزی سے زوال آ رہا ہے، اور ہندوستان جو مرکز بن گیا تھا، اخیر میں یمن مرکز تھا، ہماری نظر ہے تاریخ پر، دور ممالک عربیہ کی تاریخ پر، یمن مرکز بن گیا تھا، پھر اس کے بعد حجاز مرکز بنا، اسی زمانے میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی حجاز گئے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب حجاز گئے، وہاں سے علم حدیث لے کر آئے، پھر یمن کے اساتذہ و شیوخ یہاں آئے، شیخ حسین بن محسن انصاری آئے اور ہندوستان کے بڑے بڑے عالم ان کے شاگرد ہوئے، اور اس میں ایک نئی طاقت اور ایک نیا شباب پیدا ہوا۔

تو حدیث کا فن بھی بہت تیزی سے زوال کی طرف جا رہا ہے، اس کی طرف بھی آپ کو توجہ کرنے کی ضرورت ہے، اس کے جو مقدمات ہیں ان کو اچھی طرح سے پڑھیں، اور پہلے سے تیار ہو کر جائیں، اور اس کے بعد بھی مطالعہ کریں، اور احادیث کی شروح بھی دیکھیں، اور اس میں پھر محدثین کے حالات سے واقفیت آپ کو ہونی چاہیے، بڑی کتابیں تذکرۃ الحفاظ وغیرہ پڑھیں، لیکن کم از کم شاہ عبدالعزیز صاحب کی بستان المحدثین، اور پھر اس کے بعد آپ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی چیزیں پڑھیں، اور حدیث کو بحیثیت فن کے، اور ایک بہت بڑے مکتبہ کے، ایک بہت بڑے مستقل کتب خانہ کے آپ اس سے تعلق اور مناسبت پیدا کریں، اور اس سے ایسا تعلق خاطر پیدا کر لیں کہ جب اللہ تعالیٰ آپ کو موقع دے تو آپ جا کر اس کا درس دے سکیں۔

آج بڑے بڑے مدرسوں میں مسندیں خالی ہو رہی ہیں، اس وقت نام لینے کی ضرورت نہیں، مگر جہاں افغانستان اور صوبہ سرحد اور اب جو پاکستان کہلاتا ہے، اور ہندوستان کے آخری کنارے اور جو بنگلہ دیش کہلاتا ہے، جہاں وہاں سے طلبہ آتے تھے ان سے پڑھنے کے لیے اور استفادہ کے لیے، اور عرب تک آتے ہوں تعجب نہیں، آج وہاں ان کے درجہ کے لوگ نہیں ہیں، اور تقریباً پورے ہندوستان کا حال یہ ہو رہا ہے، تو حدیث میں بھی

اختصاص پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

صرف ونحو میں رسوخ پیدا کریں

اور پھر اس کے بعد سب کے جو مقدمات ہیں، صرف ونحو میں آپ کو رسوخ ہو، آپ اس پر پورے طور پر حاوی ہوں، اور عبارت صحیح پڑھنا تو معمولی بات ہے، جو نحوی توجیہ ہے اور صرفی توجیہ ہے اور تصحیح ہے، اور اس میں جو نزاکتیں ہیں، ان سب کو آپ سمجھتے ہوں، اس چیز کی طرف بھی آپ کو توجہ کرنی چاہیے۔

عربیت کی طرف توجہ کی ضرورت

اور ایک بات میں یہ کہوں گا کہ عربیت کی طرف بھی توجہ کرنے کی ضرورت ہے، بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ عربیت ندوہ کا گویا ایک امتیازی نشان ہے، اور گویا ایک موروثی چیز ہے، وہ چلی آرہی ہے، اس لیے اس کا نام لیا جاتا ہے، یہ گویا یہاں کا ایک افتخار بن گیا ہے، باقی اس کی کوئی اور قدر وقیمت اور اس کے فوائد ذہن میں نہیں ہیں، یہ بات نہیں ہے، عربی زبان قرآن مجید کے اعجاز کو سمجھنے کے لیے، بلکہ قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے، اعجاز تو بڑی چیز ہے، قرآن مجید کے فہم کے لیے، حدیث کے فہم کے لیے، فقہ کی باریکیوں اور جو مجتہدین کے آراء ہیں، اور ان کے فتاوی ہیں، ان کے فیصلے ہیں، ان کے فرق کو سمجھنے کے لیے، اس فرق کے معنی کو سمجھنے کے لیے جو بعض مرتبہ الفاظ پر موقوف ہوتے ہیں، اس سب کے لیے صرف ونحو میں پوری کامل استعداد حاصل کرنی چاہیے، اور اس میں آج کل عام طور پر بہت ہی گراوٹ اور ایک انحطاط پیدا ہوگیا ہے کہ مدرس کے لوگ آتے ہیں اور ہمیں بہت سے امتحان لینے والے اساتذہ بتاتے ہیں کہ دو سطر بھی صحیح عبارت نہیں پڑھ سکتے۔

دوسری بات یہ کہ اس کی قدر وقیمت، کہ اس وقت عالم اسلام میں ممالک عربیہ کی حیثیت سے، ممالک عربیہ پہلے تو اسلام کا مرکز تھے، خاص طور سے حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب، لیکن اب بھی ممالک اسلامیہ دین کا سرچشمہ، دین کا مرکز ہیں، اور دنیا کی سیاست

ہیں اور اسلام کے مستقبل میں، اسلام کی آئندہ تاریخ میں اور مستقبل میں ممالک اسلامیہ کو
بہت بڑا رول، بہت بڑا کردار ادا کرنے کا موقع ہے، اور موقع رہے گا، اور اس کی اہمیت رہے
گی، اور یورپ و امریکہ کی جیسی نظر ممالک عربیہ پر ہے، اور ممالک عربیہ کے افساد پر ہے،
ممالک عربیہ میں بے دینی پیدا کرنے پر ہے، ممالک عربیہ میں اسلام پر اعتماد کھو دینے،
اسلام پر سے اعتماد اٹھ جانے کی صلاحیت پیدا کرنے اور اس کے لیے نئی نسل کو تیار کرنے کے
جیسے منصوبے امریکہ اور یورپ میں ممالک عربیہ کے لیے تیار ہو رہے ہیں، میں اپنی عملی
واقفیت اور اپنی سیاحتوں کی بنا پر اور اپنے ان حلقوں سے تعلق کی بنا پر کہتا ہوں کہ وہ توجہ
یورپ و امریکہ کی نہ پاکستان پر ہے، نہ ایران پر ہے، اور نہ ہندوستان پر ہے۔

تو ان ممالک عربیہ میں ایسے فتنے اٹھ سکتے ہیں، ایسی تحریکیں پیدا ہو سکتی ہیں، ایسے
رجحانات پیدا ہو سکتے ہیں کہ ان میں ضرورت ہے ان کا مقابلہ کرنے کی، اور عربوں کو ان کی
زبان میں متاثر کرنے کی، اور ان کے ذہن کو بدلنے کی، اور یہ اتنا بڑا دعوتی کام بلکہ اتنا بڑا
اجتہادی کام، اتنا بڑا اپنے وقت کا جہاد، اپنے وقت کی عبادت ہوگی کہ جس سے روح نبوی کے
خوش ہونے کی امید کی جا سکتی ہے۔

سب سے بڑھ کر فخر و شکر کی بات

میں آپ سے مسجد میں بیٹھ کر کہتا ہوں کہ روح نبوی جس سے سب سے زیادہ شادماں
ہوگی، وہ یہ ہے کہ جن کے صدقے میں آپ کو ایمان ملا ہے، جن کے طفیل میں آج آپ
مسلمان ہیں، جنھوں نے آپ کو کلمہ پڑھایا ہے، آپ اگر وہاں کوئی خدمت پیدا ہو رہی ہو تو
آپ کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی توفیق کی بات، اس سے بڑھ کر کوئی فخر و شکر کی بات، اس
سے بڑھ کر، اگر اتنا لفظ بے محل نہ ہو تو میں کہوں، اس سے بڑھ کر معراج نہیں ہو سکتی، وہ معراج تو
معراج آسمانی تھی، لیکن میں اس معراج زمینی کے متعلق کہتا ہوں، میں اس معراج اصلاحی
کے متعلق کہتا ہوں، میں اس معراج سعی کے متعلق کہتا ہوں، اس سے بڑھ کر کوئی معراج نہیں
ہو سکتی، الحمد و کبریٰ ہیں یا آپ نہیں، اعداد کو فخر کرنے کا حق حاصل ہے، ہمارا اگر اس پر فخر کریں

پیدا کریں کہ آپ وہاں جائیں گے۔ میں آپ سے ایک بات کہتا ہوں، اللہ مجھے معاف
فرمائے، اللہ مجھے معاف کرے، اور خواندہ نہ فرمائے، لیکن اس وقت آپ کے فائدہ کے
لیے کہتا ہوں کہ اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ تمھیں اپنی عمر میں سب سے بڑی عزت کا کون سا
موقع حاصل ہوا ہے؟ اور تم سب سے زیادہ کس بات پر خوش ہوئے ہو جو تم نے اللہ کا شکر ادا
کیا ہے؟ تو میں آپ سے اس وقت کہتا ہوں کہ میں ایک مرتبہ مکہ معظمہ گیا، اور جایا کرتا تھا، ہر
سال جایا کرتا ہوں، اور میرے جانے کی سب کو خبر بھی نہیں ہوتی، جمعہ کا دن آیا، جمعہ کی نما
ز کا وقت آیا، اور میں گیا تو خطیب حرم شیخ عبداللہ الخیاط نے جو بڑے فاضل تھے، انھوں نے
اپنے خطبہ میں میری تحریر کا ایک اقتباس پڑھا، پوری تحریر کا ایک پورا اقتباس پڑھا، یقول أحد
الفضلاء، یقول أحد المفکرین، جب اس طرح پھر کر، تو مجھے یاد آگیا کہ یہ میری فلاں تحریر
کا، ماذا خسر العالم کا، یا کسی فلاں کتاب کا اقتباس ہے، تو میں نے کہا: اللہ اکبر! رائے
بریلی کا دیہاتی، رائے بریلی کا اردو بولنے والا، جو ذات بات میں، حسب میں، کسی چیز میں کوئی
فوقیت نہیں رکھتا، اس نے ندوۃ العلماء میں تعلیم پائی، اور عرب استادوں سے پڑھا، اور آج وہ
اتنے بڑے مجمع میں، اور اللہ تعالیٰ کی سب سے محبوب ترین زمین میں، حرم شریف میں، بیت
اللہ شریف کے سامنے جو خطبہ دیا جا رہا ہے، جس سے بڑھ کر کسی فرمانروا کا کوئی خطاب، کسی
شہنشاہ کا کوئی خطاب نہیں ہوسکتا، وہ خطیب جو منبر پر کھڑا ہے، وہ جو خطاب دے رہا ہے،
اس کے برابر دنیا میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا، اس کلام میں مجھ جیسے ہندی کی عبارت شہادت کے
طور پر نقل کی جا رہی ہے تو اس سے مجھ پر جو اثر ہوا وہ آج تک مجھے یاد ہے۔

پھر اس کے بعد اتفاق سے دوسرے دن یا تیسرے دن، یاد نہیں، یا اسی رات وہاں کے
رئیس المطوفین جو ہندی الاصل تھے، شاید بھوپال کی طرف کے تھے، انھوں نے دعوت کی، تو
اس میں کئی علماء کو بلایا، اور خطیب صاحب کو بلایا، اور مجھے بھی بلایا، تو میں نے کہا کہ فضیلۃ الشیخ!
آپ نے خطبہ میں ہماری ایک عبارت پڑھی، ہمیں بڑی خوشی ہوئی، اور بہت شرم بھی آئی،
بہت فخر ہوا، کہنے لگے کہ میں تو کئی مرتبہ تمہاری عبارتیں پڑھ چکا ہوں۔ پہلے نام لے کر پڑھا کرتا

عربی پر زور کیوں؟

یہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں اور کہنے لگے ہیں کہ کیا ندوہ میں عربی عربی عربی کا ہر وقت چرچا اور زور دیا جاتا ہے، نہیں ! یہ اس لیے کہ آپ کچھ حق ادا کر سکیں، وہ حق ادا نہیں ہو سکتا، صاف کہتا ہوں حق نہیں ادا ہو سکتا، اگر ہم جان دے دیں جب بھی حق ادا نہیں ہو سکتا، لیکن بہر حال حق ادا کرنے کی کوشش بھی ایک طرح کی شرافت ہے، وہ یہ کہ جن کے ذریعہ سے ہم کو ایمان ملا، جن کے ذریعہ سے ہم کو انسانیت ملی، اخلاق ملے، شعور ملا، خدا شناسی ملی، رسول سے تعلق ملا، ان کو ہم دین کی بات سنا سکیں، اور ان کے کسی انحراف پر ہم ان کو ٹوک سکیں، ان کا محاسبہ کر سکیں۔

آپ کو معلوم ہے جب قومیت عربیہ کی تحریک شروع ہوئی، تو سارا عالم عربی گونج رہا تھا، لیکن یہ میں نہیں کہتا، مجھ سے وہاں کے بعض معتبر دوستوں نے کہا، شیخ محمد محمود الصواف نے کہا، جن کا ابھی انتقال ہوا ہے، بڑے مجاہد تھے، اور قائد تھے، اور رابطہ عالم اسلامی کے ممبر بھی، انھوں نے کہا کہ آپ لوگوں نے جیسا، اور نالبعث العربي اور آپ کے پرچوں نے جس طرح جمال عبدالناصر کو ننگا کیا، اور جس طرح قومیت عربیہ پر ضرب لگائی، ہمارے یہاں کسی نے نہیں لگائی، اور پھر جو وہاں تقریریں ہوئیں مدینہ طیبہ میں، اللہ نے ہمیں توفیق دی، تقریباً ہر سال تقریر ہوتی تھی قومیت عربیہ اور اس طرح کی چیزوں پر، اور مکہ معظمہ میں، یہاں چوٹی کے لوگ، شیخ محمد سرور الصبان جیسے آدمی، جو وزیر مالیات رہ چکے تھے، اور رابطہ عالم اسلامی کے بانی اور سکریٹری جنرل تھے، وہ بھی تھے، وہاں ہم نے ان عربوں سے کہا: دِفاعًا يُّهَا العَرب! اور اس کے بعد ہم نے کہا کہ آپ جمال عبدالناصر کو اسلام کی دعوت کے سامنے اپنا بطل، اپنا ہیرو مانتے ہیں، آپ سے زیادہ غیرت دار تو ہندوستان کے ہندو ہیں جو ہر سال راون کو جلاتے ہیں، وہ راون کو جلاتے ہیں کہ وہ رام چندر جی کا مخالف تھا، اور آپ محمد رسول اللہ (ﷺ) کے سامنے، آپ کی دعوت کے سامنے جو کھڑا ہوا ہے، حجاب بن گیا ہے، جو قومیت عربیہ کی طرف بلا رہا ہے، آپ اس کی قدر کرنے اور اس کی تعریف کرنے کی دعوت

دیتے ہیں، تو ہم نے کہا: رفقاً رفقاً یا محب العرب! مجبوراً موافق دور بیٹھے تھے، انھوں نے
کہا: سحقاً سحقاً، یا محب العرب! اور ہماری آواز میں آواز ملائی، اور کہا کہ یہ نہ کہیے، یہ کہیے۔

یہ سب تب ہوگا جب آپ کو عربی زبان پر قدرت ہوگی، اور جب آپ قدر کریں گے
یہاں اور یہاں کے اساتذہ کی، الحمد للہ نام لینا مناسب نہیں، ورنہ میں نام بھی لیتا کہ اللہ تعالیٰ
نے یہاں ایسے اساتذہ دیے ہیں، کہ جو کم عربی زبان اور انشاء اور صحافت اور اسلام کی
دعوت دینے کے لیے، اور اسلامی فکر کو عربی میں اس کا تعبیر کرنے کے لیے، جن کی مثال دور
دور نہیں ملتی، اور عربوں کے خطوط ہمارے پاس آتے ہیں، اور ان سے زبانی ہم نے سنا ہے،
اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

میرے عزیزو! یہ چند باتیں ہیں، اخلاص، اختصاص، اور تفسیر، حدیث، فقہ، جس جس
مرحلے کے یہ فنون ہیں، ان مرحلوں کے لحاظ سے آپ ان کی طرف توجہ کریں، اور ان میں سے
کسی میں اختصاص پیدا کریں، اس لیے کہ بہت تیزی سے زوال ہو رہا ہے، آج بھی
کوئی ایسی مسند درس حدیث کی نہیں کہ جس کے لیے دوسرے ملکوں سے لوگ سفر کر کے
آئیں، آخر میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب تھے، وہ بھی اس دنیا سے رحلت
فرما گئے، اور ان سے پہلے حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی، ان سے پہلے مولانا انور شاہ
صاحب تھے، اور ہمارے یہاں بھی اسی ندوہ میں مولانا حیدر حسن خاں صاحب (رحمۃ اللہ
علیہ) تھے جو شیخ حسین بن محسن الانصاری کے خاص شاگرد تھے، اور جلد جلد یہ لوگ تھے،
اب وہ حدیث کی مسند بھی خالی ہو رہی ہے، کوئی اس میں اختصاص پیدا کرے، اور فقہ سے
عمومی تعلق اور مناسبت ہونی چاہیے۔

اور پھر اس کے بعد عربیت کو آپ تفریح نہ سمجھیں، یہ نہ سمجھیں کہ یہ ایک تفریحی چیز ہے، اور
ایک فیشن بن گیا ہے، اور ندوہ والے اس پر فخر کرتے ہیں۔ بلکہ اس کو دعوت کا ایک ذریعہ سمجھ کر،
دعوت کی زبان سمجھ کر، اور قرآن کی زبان سمجھتے ہوئے اپنی محنت کا میدان بنائیں، اور جب
دعوت قرآن کی زبان میں دی جائے تو اس کے اثر کو کون روک سکتا ہے؟ کوئی دل نکال کر کے
رکھ دے، آپ بھی وہ بات نہیں، جو بھی قرآن کی زبان میں دعوت دینا بہت بڑی بات ہے، اس

کے لیے آپ صلاحیت پیدا کریں تقریر میں بھی اور تحریر میں بھی، اور اللہ تعالیٰ نے اس کا سامان مہیا کیا ہے، الستادی العربی وغیرہ میں بھی آپ شریک ہوں، یہاں کے البعث الاسلامی اور الرائد پڑھیں، اور پابندی سے پڑھیں، اور اس کے علاوہ آپ تقریر کی مشق کریں، اور پھر یہاں ہمارے ایسے جوان اور ادھیڑ اساتذہ ہیں جو اگر آج بھی کسی جامعہ عربیہ میں چلے جائیں تو ہاتھوں ہاتھ لیے جائیں، اور ان کو مسند درس پہ بٹھایا جائے، الحمد للہ، میں نام نہیں لیتا ان کا، لیکن آپ ان سے واقف ہیں، اور واقف ہو سکتے ہیں، تو ادھر توجہ کریں۔

دینی امور کا اہتمام

اور پھر اس کے بعد یہ کہ یہاں نمازوں کی پابندی خود اپنے شوق سے، جلد سے جلد اذان کے بعد حاضری، اس سے پہلے بھی مسجد سے ایک تعلق ہو، نوافل بھی پڑھیں، اللہ آپ کو توفیق دے، کچھ فجر سے پہلے دو چار رکعت کی توفیق ہو جائے تو بہت بڑی بات ہے، یہ سب چیزیں معاون ہیں آپ کی تعلیم کے لیے بھی، اور تعلیم کے بغیر بھی ان کی فضیلت اپنی جگہ ہے، تو یہ اور اس کے بعد یہ باہر کا جانا آنا، اور گھومنا پھرنا اس کو کم کریں، یہ ہمیں دیکھ کر بڑا افسوس ہوتا ہے، ہم اکثر گاڑی پہ باہر سے آتے ہیں، تو ہم دیکھتے ہیں کہ ایک پارٹی ادھر سے ادھر جارہی ہے، ایک پارٹی ادھر جارہی ہے، ایک پارٹی ادھر جارہی ہے، اس میں بھی حتی الامکان کمی کریں، اضطراراً آپ شہر میں نکلیں، اس لیے کہ شہر خصوصاً آج کل کے شہر، وہ تو ایسی چیزیں ہیں کہ اگر ہو سکے تو کوئی شریف آدمی اور جس کو اپنی عفت نگاہ اور عفت قلب مطلوب ہے، وہ تو وہاں مضطر ہو کر جائے تو جائے، ورنہ جانا پسند نہیں کرے گا۔

تو زیادہ تر یہاں وقت گزاریں، اور درجہ میں حاضری کی پابندی کریں، اور نمازوں میں سب سے پہلے آنے کی کوشش کریں، جلد سے جلد آنے کی کوشش کریں، اور پھر نماز کو ترقی دینے کی بھی کوشش کریں، اور پھر اس کے بعد یہ کہ ان علوم کے لیے، کتابوں کے لیے مطالعہ دیکھیں، اور اپنی استعداد میں جو خامی نظر آئے، اس خامی کو پورا کرنے کی کوشش کریں، اگر آپ کی فلاں چیز کمزور ہے تو اس کی طرف خصوصی توجہ کریں، فلاں چیز کمزور ہے تو اس کی

صرف خصوصی توجہ کریں، اور اپنے اساتذہ کو مطمئن کریں، ان کی دعائیں لیں، اور آپ یہاں سے ایسے ندوی فاضل بن کر نکلیں کہ ان پر صرف ندوے ہی کو فخر نہ ہو، ہندوستان کو فخر ہو، اور آپ جہاں جائیں ہاتھوں ہاتھ لیے جائیں۔

الحمد للہ کہ ندوہ کا اس وقت ایک مقام ہے، میں یہ آپ سے اس لیے نہیں کہتا کہ میں اس کا ایک خادم، ناظم ہوں، یا اس کا فرزند ہوں، بلکہ آپ سے کہتا ہوں کہ آج بلادِ عربیہ میں ندوہ کا جو احترام ہے، اور اس کی جو وقعت ہے، وہ میں نہیں کہتا کہ کسی مدرسے کی نہیں، لیکن وہ بہت قابلِ شکر اور قابلِ فخر ہے، کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ندوہ کا ایک اسلوب ہے، اسلوبِ فکر ہے، اسلوبِ تحریر ہے، اسلوبِ صحافت ہے، اور وہاں ہر چیز پر فکرِ اسلامی غالب ہے، اور وہ لوگ کسی مغربی چیز کا اس طرح سے آسانی سے شکار نہیں ہوتے جس طرح سے ہماری جامعات کے لوگ ہوتے ہیں۔

خلیج میں جا کر نوکری کرنا آپ کے مقام سے فروتر ہے

پھر اس کے بعد ایک بات یہ بھی میں کہہ دوں، بہت سے طلاب ہمارے یہاں اس لیے آتے ہیں کہ یہاں سے پڑھ کر دیارِ عربیہ میں، خلیج وغیرہ میں جائیں، اور وہاں جا کر نوکری تلاش کریں۔ یہ چیز بھی آپ کے مقام سے فروتر ہے، مجبوری کی بات الگ ہے، میں کوئی فتویٰ نہیں دیتا کہ یہ حرام ہے یا ناجائز ہے، مکروہ ہے، لیکن آپ کے مقام سے فروتر ہے۔ آپ کوشش یہ کریں کہ وہاں داعی بن کر کے جائیں، آپ وہاں خطیب بن کر کے جائیں، مفکرِ اسلامی بن کر کے جائیں، تو آپ دیکھیں گے کہ آپ کا احترام بھی ہوگا، اور باقی یہ کہ جواز اور اباحت میں کوئی کلام نہیں، اور اس کے بعد یہ کہ آپ میں سے کچھ لوگ جامعات میں چلے جاتے ہیں، یہاں کی یونیورسٹیوں میں چلے جاتے ہیں، ہمیں وہاں دیکھ کر بڑا افسوس ہوتا ہے، ہمارا بھی آنا جانا ہوتا ہے علی گڑھ پہلے ہم بہت جایا کرتے تھے، اب تو برسوں سے نہیں جانا ہوا، لیکن اور بعض یونیورسٹیوں میں کہ وہاں جاتے ہی ان کی وضع بدل جاتی ہے، لباس بدل جاتا ہے، پہچاننا مشکل ہوتا ہے کہ یہ ندوی تھا، بڑی شرم آتی ہے، اس کی ضدی تقدیر

آ گیا؟ بالکل معلوم ہوتا ہے کہ ایک پردہ تھا جس کا انتظار تھا کہ جلدی سے موقع ملے تو ہم اس پردے کو اتار دیں، دوسرا پردہ ڈال لیں، آپ کو وہاں استقامت سے نمازوں کی پابندی میں اور وضع و ہیئت میں بھی نمونہ بننا چاہیے۔

علم میں کمال اور صلاح وخشیت الٰہی سب سے بڑی قابل احترام وردی

اور جب وضع و ہیئت کا نام آ گیا تو میں آپ سے ایک بات صفائی سے کہتا ہوں کہ یہاں کے ہر طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ داڑھی رکھے، یہاں کے طالب علم کے لیے حلق لحیہ ناجائز ہے، حرام ہے، ممنوع ہے، اور خلاف قانون ہے، اور یہاں کے طالب علم کے لیے کسی طرح یہ بات زیبا نہیں کہ وہ وہ لباس اختیار کرے جس سے یہ شبہ ہو کہ یہ کالج کا طالب علم ہے، یونیورسٹی کا طالب علم ہے یا کسی عربی مدرسے کا طالب علم ہے، ٹخنے سے نیچے پائجامہ ہونے کو جب شریعت نے ناپسند کیا ہے تو کچھ وجہ ہے، بار بار آتا ہے کہ خَالِفُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى، خَالِفُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى، یہود و نصاریٰ کے شعارات کو منع کیا گیا ہے، اس لیے کہ ان کا نفسیاتی اثر ہوتا ہے، اور یہ پیغمبر کی زبان سے یہ بات نکلی تھی، تو داڑھی شرعی داڑھی ہونی چاہیے، صورت شکل مولویوں کی سی، صفائی سے کہتا ہوں مولویوں کی سی ہونی چاہیے، اس سے شرمانا نہیں چاہیے، اور کسی مولوی کو اب شرمانے کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ ہمارے سامنے انگریزی داں لوگوں کے، ماہرین کے، یورپ، امریکہ سے واپس آنے والوں کے، برسوں وہاں زندگی گزارنے والوں کے اور جو ان کے اسپیشلسٹ (Specialist) اور بڑے بڑے باکمال ہیں، ان کے مطالعہ اور ان کے علم، ان کے فہم، ان کی تحقیق، ان کے کردار، ان کے اخلاق کے وہ نمونے ہمارے سامنے آ چکے ہیں کہ بالکل رعب ان کا اٹھ گیا ہے، سب دھوکہ ہے، کوئی ہم پر ان کو تفوق حاصل نہیں ہے، آپ اپنے فن میں کمال پیدا کریں، تو آپ دیکھیں گے آپ یورپ جائیں گے تو وہاں آپ کا احترام ہوگا۔

ہم نے وہاں کے بڑے بڑے مستشرقین سے باتیں کی ہیں، انھوں نے بہت توجہ سے ہماری باتیں سنی ہیں، تو بس ایک بات یہ کہنا ہے کہ اس میں شرمانے کی بالکل ضرورت نہیں، ہم آپ سے صاف کہتے ہیں، یہاں آپ رہیں تو آپ یہاں عالموں کی شکل اختیار کریں، اپنے استادوں کی تقلید کریں، اور علمائے ربانی کی تقلید کریں، اور بالکل اس سے نہ شرمائیں، اور آپ کو تمام شرعی حدود اور محظورات کا پورا خیال رکھنا چاہیے، اور کم سے کم اس کی اجازت بالکل نہیں ہے کہ آپ یہاں رہ کر آزادی کے ساتھ داڑھی منڈائیں اور بالکل دسکول کے ایک طالب علم معلوم ہوں، اور اس طرح کا لباس آپ پہنیں، کوٹ پتلون پہنیں، اس کی یہاں اجازت نہیں دی جاسکتی، اور یہ کسی معنی میں بھی آپ کے لیے مفید نہیں ہے۔

علمائے ربانی اور نائبین رسول سے ظاہراً و باطناً مشابہت

آپ یاد رکھیے، جتنا ظاہراً و باطناً آپ کو مشابہت ہوگی علمائے ربانی سے، نائبین رسول سے، مشائخ کرام، اولیائے عظام سے، اور خادمین حدیث و فقہ اور حاملین علم سے، اتنی ہی آپ میں مقبولیت اور محبوبیت پیدا ہوگی، اللہ تعالیٰ کی مدد آپ کے ساتھ ہوگی، آپ کا احترام کیا جائے گا، اور آپ کامیاب زندگی گزاریں گے۔

اختصاص اور امتیاز جھکاتا اور احترام پر مجبور کرتا ہے

یہ سب غلط ہے کہ فلاں شعار اختیار کر لینے سے یہ ہوتا ہے، فلاں شعار اختیار کر لینے سے یہ ہوتا ہے، علم جھکاتا ہے، اختصاص اور امتیاز، کوئی علمی امتیاز، کوئی تحقیقی کتاب، کوئی تحقیقی مقالہ، وہ بڑے بڑے امراء کو بلکہ بعض اوقات ملوک اور بادشاہوں تک کو احترام پر مجبور کر دیتا ہے، اور الحمدللہ ہم بھی اپنی تمام پستیوں کے باوجود اس منزل سے گزر چکے ہیں، کہ بادشاہ بھی احترام سے ملے ہیں، تو یہ سب باتیں محض مغالطہ ہیں کہ ہم یہ پہن کر جائیں گے تو ہمارے گاؤں میں عزت ہوگی، قصبہ میں عزت ہوگی، بازار میں عزت ہوگی، ہمارے بہت برادری کے لوگ جو انگریزی داں ہیں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھتے ہیں، وہ ہمارا

احترام نہیں کرتے، کچھ نہیں، آپ کا علم سب سے بڑا سائن بورڈ ہے، اور سب سے بڑی قابلِ احترام وردی ہے، یہ وردی ہے آپ کی اصلی علم میں کمال اور صلاح اور خشیت الٰہی اور سنتوں کی پابندی، اور عبادت کا ذوق اور صلاح کی کوشش۔

اس وقت کا سب سے بڑا فتنہ

آخر میں ایک بات کہہ کر ختم کرتا ہوں کہ دیکھیے! اس وقت ہندوستان میں ایک ایسا دور آ رہا ہے جو ہمارے علم میں اس سے پہلے کبھی نہیں آیا، دورِ اکبری کو کسی قدر مشابہت ہے، لیکن دورِ اکبری بھی اس درجہ میں خطرناک نہیں تھا جتنا یہ دور ہے، جو اب چل رہا ہے، وہ یہ کہ اس وقت اکثریت نے یہ طے کر لیا ہے کہ اس ملک کو اپنی بنا کر رہیں گے، یعنی اس میں مسلمان رہیں گے لیکن اپنے تمام ملی تشخصات کو چھوڑ کر، ابھی زبان سے اوپر یہ بات نہیں آئی لیکن ہمیں معلوم ہے (ہمیں ایسے لوگوں سے ملنا ہوتا ہے) کہ اذانیں بھی زور سے نہ ہوں، اذان تو خیر الگ چیز ہے، وہ کوئی مسنون چیز نہیں، مسجدوں کی کثرت بھی اور مسجدوں کا جانے دیجئے بھی، اور مسجدوں کا وجود بھی خطرے میں ہے، اور بابری مسجد کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا اس نے اس کے لیے راستہ کھول دیا ہے، اور اب وہ ہندو اخبار نویس اور کالم نگار، اور ان کے سوچنے سمجھنے والے، انگریزی اور ہندی اخباروں میں جو مضامین نکل رہے ہیں، ان میں صاف صاف یہ ہے کہ یہاں مسلمانوں کو بالکل ہندو بن کر رہنا ہوگا، ہندوستانی بن کر رہنا ہوگا، یہاں مسلمان بن کر رہنے کی اب گنجائش نہیں ہوگی، وہ اپنی وضع، صورت و شکل میں، اور زبان میں، اور رسم الخط میں، اور تہذیب میں، سب میں ان تمام امتیازی خصوصیات سے دستبردار ہو جائیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہو اور رہے کہ یہ مسلمان ہیں، یہ کہا جائے کہ یہ مسلمان ہیں۔

اس فتنہ کو روکنے کے لیے علماء کی ذمہ داریاں

اس وقت اس فتنہ کو روکنے کے لیے سب سے بڑی طاقت جو ہو سکتی ہے وہ علماء کی ہو سکتی ہے، وہ ہمارے فضلائے مدارس کی ہو سکتی ہے، کہ وہ جہاں جہاں کے رہنے والے ہوں،

وہاں کی مسجدوں میں تقریر کریں، جمعہ کے دن تقریر کریں، عیدین میں تقریر کریں، خوشیوں کے موقع پر تقریر کریں، نکاح وغیرہ کی مجلسوں میں تقریر کریں، کہ ہم کو اپنے پورے ملی تشخص کے ساتھ اس ملک میں رہنا ہے، کسی ایک چیز کو نہیں چھوڑنا ہے، ہم اس کے لیے بھی تیار نہیں کہ ہمارا پائینچہ ٹخنے سے نیچے ہو، ہم اس کے لیے تیار نہیں کہ ہم اپنی داڑھی کو ایسا کرلیں کہ سمجھا جائے کہ اتفاقاً کچھ بال اُگ آئے ہیں، نہیں، نہیں، ہم بالکل شریعت پر عمل کریں گے، اور شریعت کے ساتھ رہیں گے، اور ہمارا نظام تعلیم وہی رہے گا، ہم اپنے بچوں کو توحید کی تعلیم دیں گے، دینیات پڑھائیں گے، اردو سے واقف بنائیں گے، اردو رسم الخط کو زندہ رکھیں گے، یہ سب سے بڑی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے، اور آپ ہی سب سے بہتر طریقہ پر اس ذمہ داری کو ادا کر سکتے ہیں۔

اس وقت کا اہم ترین فریضہ

یہ باتیں سن لیجیے، اور دل پر لکھ لیجیے، کہ اس وقت کا سب سے بڑا فتنہ جو ہے، وہ ہے یک جہتی متحدہ کلچر، اور ملی تشخص سے دستبردار ہونا، اور افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے دینی حلقے یا علمی حلقے کے بعض لوگ بھی جو قلم کا استعمال جانتے ہیں، اور علمی زبان میں بات کر سکتے ہیں، وہ بھی اس کی دعوت دینے لگے ہیں کہ مسلمانوں کو کسی بات پر اصرار نہیں کرنا چاہیے، اور پرسنل لا کے سلسلے میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کے خلاف جو اصرار کیا، یہ بھی مسلمانوں کی ایک غلطی تھی، خواہ مخواہ کے لیے ہندوؤں میں ایک رد عمل پیدا ہوا، اور وہ سمجھے کہ مسلمان بہت متشدد اور تنگ نظر ہیں۔

نہیں! ہم صاف صاف کہتے ہیں، ہم یہاں اپنی پوری خصوصیات کے ساتھ رہیں گے، اور اس کے ساتھ ہم امید رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اس ملک کی قیادت نصیب فرمائے گا، اس لیے کہ اس ملک کی آبادی کے کسی عنصر نے اپنے کو اس قابل نہیں رکھا کہ اس ملک کو خطرے سے بچائے، سب دولت پرست ہیں، مادہ پرست ہیں، نفس پرست ہیں، طاقت پرست ہیں، اقتدار پرست ہیں، جاہ پرست ہیں۔

زبان وادب کی اہمیت اور اس کی ضرورت

قوت بیانیہ کی نعمت

عزیز بھائیو اور فرزندانِ دار العلوم! مجھے بہت خوشی ہے کہ "الاصلاح" کے اس دوسرے بازو اور اس دوسرے خاندان میں آنے اور اپنے عزیزوں کو دیکھنے اور ملنے کا موقع ملا ہے، "الاصلاح" در حقیقت اس قوت بیانیہ کو پیدا کرنے کی جگہ ہے جو زبان وقلم کے ذریعہ سے وقت اور دین کے تقاضوں کو پورا کر سکے، اور دین پر جو حملے ہو رہے ہیں ان کا جواب دے سکے، اور پڑھے لکھے لوگوں کے ذہنوں میں اسلام پر وہ اعتماد بحال کر سکے جو متزلزل ہوتا جا رہا ہے، اور جس کے بہت سے اسباب ہیں اور ان اسباب پر کتابوں میں اپنے اپنے رقبہ اور اپنی اپنی وسعت کے مطابق بحث کی جا چکی ہے۔

کل "النادی العربی" کے جلسے میں میں نے کہا تھا کہ اللہ کی ذات بے نیاز ہے، غنی ہے، اس کو نہ وسائل کی ضرورت ہے، نہ طاقتوں کی، خواہ جسمانی ہوں، ذہنی ہوں، یا معنوی ہوں، کسی چیز کی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی جگہ قوت بیانیہ کا ایک نعمت کے طور پر تذکرہ کیا ہے اور اس کی تاثیر بیان کی ہے، مثلاً اس نے کہا کہ ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ﴾[1] یہاں تک ہی کافی تھا، اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کے لحاظ سے کہ ﴿لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ﴾ "تاکہ آپ ڈرانے والے بنیں" لیکن اس کے بعد فرماتا ہے: ﴿بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ﴾ آپ ڈرانے والے بنیں ایسی عربی زبان میں جو واضح کرنے والی ہو، دل نشین ہو اور جو دل ودماغ کو متاثر کرے، اور جو

(۱) سورۃ الشعراء: ۱۹۴

یقین پیدا کرے۔ اور پھر فرمایا: ﴿إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ﴾[1] یہاں عربی کہنے کی ضرورت کیا تھی؟ ﴿إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا﴾ کافی تھا، لیکن چونکہ اہل عرب مخاطب ہو رہے ہیں، اور عرب ہی داعی اول بنیں دین کے، اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے لیے نہ صرف عربی زبان کا انتخاب کیا بلکہ عربی مبین کہا، اور پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت کا جہاں ذکر کیا ہے خلقت انسانی کے موقع پر تو وہاں پر بھی اس کو فراموش نہیں کیا، یہ تو کہنا بے ادبی ہے، بلکہ اس کو ترک نہیں فرمایا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿الرَّحْمَٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْآنَ ۝ خَلَقَ الْإِنسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ﴾[2] اور انسان کو پیدا کیا اور آگے فرماتا ہے کہ ﴿عَلَّمَهُ الْبَيَانَ﴾ اس کو قوت بیانیہ عطا کی، اس کو سلیقہ دیا اس بات کا کہ وہ اپنی بات کو واضح کر سکے، دل نشیں کر سکے۔

تو یہ ایک طاقت ہے، اس طاقت کا استعمال جن لوگوں یا جس گروہ اور جس طبقہ اور جس ذہنیت اور مقاصد کے حامل لوگوں کے ہاتھ میں جاتا ہے، اس سے لوگ ویسا ہی فائدہ اٹھاتے ہیں، اگر وہ ضالین ومضلین کے ہاتھوں میں چلا جائے، قوت بیانیہ ان کو ملے اور وہ اس سے فائدہ اٹھائیں، تو وہ جاہلیت کی دعوت کا کام کرتے ہیں، اور عقائد سے لے کر اخلاق وسلوک اور پورے انسانی تعلقات سب کو متاثر کرتے ہیں، اور دنیا کی [illegible] تاریخ میں ایسا واقعہ اور ایسا دور بار بار آیا ہے کہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں قلم پہنچ گیا اور قلم تو خیر ہر ایک لے سکتا ہے، لیکن وہ چلنے والا اور متاثر کرنے والا قلم پہنچ گیا، اور ان کو وہ زبان سحر اور بیان حاصل ہو گیا جس سے وہ انقلاب پیدا کر سکیں، اور ایک ایسا ادب وجود میں آیا جس نے پورے معاشرہ کو متاثر کیا۔

آپ یونان کی تاریخ پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس میں بہت بڑا حصہ اس ادب کا تھا جو یونان سے پیدا ہوا، لا ادریت کا ادب، تشکیک کا ادب، نفس پرستی کا ادب، ان کو ملاحم یا رزمیہ نامہ اور شاہ نامہ کہتے ہیں، اگر یونانی شاہنامے پڑھیں گے جن کا عربی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے، خود عیسائیوں نے کیا ہے اور کچھ تاریخ میں محفوظ بھی ہے، پھر اگر آپ قرون وسطی کی تاریخ پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کے فساد کی بہت بڑی علت یہی تھی کہ قلم و زبان

---

(۱) سورۂ یوسف: ۲ — (۲) سورۂ الرحمن: ۱-۴

ان لوگوں کے قبضہ میں آ گئے جن کو نہ خدا کا خوف تھا، نہ انسانیت سے محبت ہی تھی، اور نہ محاسبہ کا کوئی ڈر تھا، اور وہ نفس پرست تھے، اور وہ فساد کے داعی تھے، ان کا ایسا اثر ہوا آپ کو معلوم ہے کہ یورپ بالکل ان کے چنگل میں گرفتار اور ان کے پھندے میں پھنس گیا، گبن کی (Gibbon) مشہور اور شہرۂ آفاق کتاب The History of the Decline and Fall of the Roman Empire پڑھیں یا ڈریپر (Draper) کی History of the Conflict between Religion and Science "معرکۂ مذہب و سائنس" پڑھیں۔ یہ میں آپ کو بتادوں کہ میں "الاصلاح" کا ممنون ہوں کہ میں جب یہاں پڑھتا تھا تو تعلیم کے آخری دور میں جب یہاں تدریس کا کام میرے سپرد ہوا تو مجھے اس کتاب کی ضرورت تھی، میں انگریزی جانتا تھا، انگریزی پڑھی تھی اور محنت سے میں اصل انگریزی میں کتاب پڑھ سکتا تھا، History of the Conflict between Religion and Science، لیکن مجھے یہاں اس کا ترجمہ مل گیا، مولانا ظفر علی خاں کا شاہکار ترجمہ ہے "معرکۂ مذہب و سائنس"، یہ مجھے "الاصلاح" سے ملا، اور ایسے ہی History of European Morals "تاریخ اخلاق یورپ" تھی، یہ بھی میرے لیے کام کی چیز تھی، اور ان دونوں کتابوں سے میں نے اپنی کتاب ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین میں فائدہ اٹھایا، اس لیے کہ ان دونوں کتابوں کے ترجمے ہو گئے تھے، اور بڑے لائق مترجمین کے قلم سے جو سند کا درجہ رکھتے تھے، ایک مولانا ظفر علی خاں صاحب کے قلم سے ہوا تھا، ایک مولانا عبدالماجد دریابادی کے قلم سے، میں الاصلاح کا ممنون ہوں، احسان مند ہوں، اور میں چاہتا ہوں کہ الاصلاح میں یہ صلاحیت باقی رہے کہ اس سے لوگ اپنی تصنیف و تالیف میں اور تحقیقات میں کام لے سکیں۔

میں اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ بھی کہہ رہا ہوں کہ آپ کو اپنے ذخیرۂ کتب پر ہمیشہ نظر رکھنی چاہیے کہ کون سی کتابیں ابھی حال میں شائع ہوئی ہیں، جو ہمارے طلبہ ہی نہیں بلکہ اساتذہ کی نظر سے گزرنی چاہئیں، اور میں اس کا اعتراف کرتا ہوں اور میں نے خود اپنے

متعلق شہادت دی ہے کہ اس تذکرہ بھی اس سے فائدہ اٹھاتے تھے، "الاصلاح" کوئی تفریح کی چیز نہیں ہے، اس لیے نہیں ہے کہ وہاں جا کر اخبارات پڑھے جائیں، اخبارات تو آپ ہر جگہ پڑھ سکتے ہیں، کون سی جگہ ہے جہاں اخبار نہیں آتا، یا آپ رسائل پڑھنے آئیں، سطحی قسم کے رسائل پڑھیں جو ہندوستان کے مختلف صوبوں سے نکلتے ہیں، آج کل تو ہر مدرسہ سے، ہر ادارہ سے، ہر انجمن سے، ہر شہر سے رسالے نکلتے ہیں۔

ایسی چیزیں ہونی چاہئیں "الاصلاح" کے دارالکتب میں جن سے ذہن بنے، اور جن سے با مقصد مصنفین اور داعیوں کو سلوک ملے، جن سے وہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو مطمئن کرسکیں، یہ "الاصلاح" کی بہت بڑی افادیت اور بہت بڑی خدمت ہوگی، اور اس وقت ضمناً میں کہہ رہا ہوں کہ اس کے لیے میں ایک ذمہ دار اور ناظم ندوۃ العلماء کی حیثیت سے یہ صفائی سے کہتا ہوں کہ اس میں اہتمام و نظامت دونوں آپ کی مدد کرنے اور آپ کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار ہیں، آپ نئی کتابوں کی فہرست تیار کریں، اچھے اہل نظر کے مشورہ سے اور سنجیدہ اور فکر انگیز اور مواد فراہم کرنے اور رہنمائی کرنے والی کتابوں کی، اور اس کے بعد آپ کا بجٹ اس کے لیے کافی نہ ہو تو میں اعلان کرتا ہوں کہ دارالعلوم اس میں مدد کرے گا۔

یہودی دماغ اور عیسائی وسائل

تو اس وقت یہ قوت یا یہ خواہ وہ تحریری ہو یا تقریری ہو، اس وقت اور زیادہ مسلح ہوگئی ہے، اور مسلح ہی نہیں بلکہ جیسا کہ ہمارے عزیز "الاصلاح" کے غالباً ناظم ہیں، انھوں نے جو مضمون پڑھا، اس میں انھوں نے کہا کہ یہ بات میں نے بہت دن پہلے کہی تھی کہ صدیوں کے بعد یہ بات پیش آئی ہے کہ یہودی دماغ اور عیسائی وسائل و طاقت دونوں متحد ہوگئے ہیں، حالانکہ دنیا کے جن دو مذہبوں میں زیادہ سے زیادہ تضاد ہوسکتا ہے، وہ یہودیت اور عیسائیت ہیں، عیسائیت کی بنیاد اس پر ہے کہ مسیح ابن اللہ ہیں، اور یہودیت کی بنیاد اس پر ہے کہ وہ حضرت مسیح پر تہمت لگاتے ہیں، ایسی تہمت لگاتے ہیں، جو کوئی عیسائی برداشت نہیں کر سکتا، لیکن اس کو عیسائیوں نے فراموش کر دیا، یہاں تک کہ پاپائے اعظم نے یہ قصور معاف کر

دیا یہودیوں کا، جو عیسیٰ علیہ السلام پر اعتراض کرتے تھے، تہمت لگاتے تھے، تو اس وقت ایک بڑی گہری سازش ہے دنیا میں اور اس نے اس وقت عنوان اختیار کیا ہے Fundamentalism کا۔ جب روس کے زوال کے بعد امریکہ نے یہ سمجھا اور برطانیہ اور عیسائی اور بڑی طاقتوں نے کہ اگر اب خطرہ ہو سکتا ہے اور کوئی حریف میدان میں آ سکتا ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔ اس لیے بڑی ہوشیاری سے اور اس میں یقیناً یہودی دماغ کام کر رہا ہے، انھوں نے اس کو عنوان دیا ہے Fundamentalist کا یعنی اصول پرست، گویا قدامت پرست اور حق پرست، یا یوں کہیے کہ جو قدیم ذخیرہ ہے اس کے پرستار، اس کی اصطلاح کی جگہ پر Fundamentalist کی اصطلاح استعمال کی جارہی ہے، اور اس کا اس قدر پروپیگنڈا ہے اور اس زور وشور اور بلند آہنگی کے ساتھ اور ایسے بعض بلکہ منظم طریقہ پر یہ بات کہی جارہی ہے، کہ کسی آدمی کے لیے مشکل ہو گیا ہے کہ وہ اقرار کرے کہ میں Fundamentalist ہوں، حالانکہ ایک مذہبی کے لیے Fundamentalist ہونا ضروری ہے، مذہبی کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ منصوصات قطعی پر، نصوص دین پر، آسمانی صحیفوں پر اور کتاب اللہ پر، عیسائی ہو تو انجیل اور اگر مسلمان ہے تو اللہ کے آخری کلام قرآن مجید کے بیانات پر، اس کے احکام پر، اس کی تعلیمات پر یقین رکھتے ہیں۔

اور اس وقت یہ Fundamantalist کی اصطلاح اتنی عام ہو گئی ہے کہ بہت ہی تاسف اور ندامت کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ ممالک عربیہ میں بھی یہ اصطلاح پہنچا دی گئی ہے، ابھی ہمارے پاس ایک خط آیا، شاید ایک ہفتہ یا دو ہفتہ ہوا ہو، میں نام نہیں لوں گا اور ایک بڑی جگہ سے آیا ہے کہ جہاں کے حاکم وسلطان ہم سے ذاتی طور پر واقف ہیں، احترام کرتے ہیں، ہمارا ان کا لندن میں ساتھ رہا ہے، اور انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ انھوں نے اپنے منطقہ میں (جس جگہ کے وہ امیر ہیں) ایک سڑک کا نام ہمارے نام پر رکھا تھا "شارع أبي الحسن الندوي"، اتنا وہ خیال کرتے ہیں، اور ایک بڑے بین الاقوامی ادارے میں وہ ہمارے ساتھ رہے ہیں، ان کے عزیز قریب کیا بلکہ ان کے ترجمان کا خط آیا ہمارے نام کہ متشددین کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ ہم چند مفکروں اور چند علماء کے

ہر طرح کی چودھراہٹ اور نفس کی تسکین کا ہر قیمت پر سامان کر لینا ہے، یہ جو بڑے بڑے مقصد تھا[1] کہ اللہ تعالیٰ جس کو فرماتا ہے، یہ سب Fundamentalist کے منکر، ان کے خیالات ہیں، اور ان کے مقاصد اور ان کی دعوت میں یہ ساری چیزیں موجود ہیں جس کو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ﴾ خیال کیجیے قرآن مجید کی بلاغت کا کہ ﴿عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ﴾ پر ان کی نیت کی ہے، اس کی نسبت کسی اور چیز کی نہیں ﴿وَلَا فَسَادًا فِي الْأَرْضِ﴾ ان لوگوں کے ہاتھوں سے کیا جو کسی اصول پر ایمان نہیں رکھتے تھے، کسی بنیاد پر ان کا اتفاق نہیں تھا، کوئی حدود ان کے لیے مقرر نہیں تھے کہ یہاں سے یہاں تک جائیں گے، اور اس کے بعد آگے نہیں جائیں گے۔

خطرناک سازش

تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ وقت بڑا نازک اور خطرناک ہے، اس میں تو دلنشیں خیال کی صلاحیت، تحریری صلاحیت اور لسانی و بیانی صلاحیت، خطابت کی صلاحیت اور تقریر کی صلاحیت ان سب چیزوں کی ضرورت ہے، اور اب وہ صرف اس لیے نہیں ہے کہ جیسے کہ آج سے پچاس برس پہلے تھا کہ آپ کسی میلاد اور کسی سیرت کے جلسے میں تقریر کر دیں، یا کسی انجمن کے پلیٹ فارم سے کوئی تقریر کر دیں، یا اپنے مدرسہ کا تعارف کرا دیں، یا کوئی نیک مقصد کے لیے جلسہ ہو اور اس میں آپ تقریر کر دیں، اب تو ایک عالمی سازش ہے، بڑے وسیع اور نہایت گہرے پیمانے پر، اور اس کے خطرات بہت دور رس اور بہت وسیع اور بہت گہرے ہیں، یہ اتنی بڑی سازش کم سے کم میرے محدود مطالعہ میں جس کے پیچھے اتنا پروپیگنڈہ ہو اور اتنے ذرائع ابلاغ ہوں، جسے آج میڈیا کہتے ہیں، ذرائع ابلاغ سب کے سب ریڈیو، ٹیلی ویژن، پریس اور کمپیوٹر، ملکوں کے دورے اور آنے جانے والے وفود یہ سب کے سب اس نکتہ پر آ کر متحد ہو گئے ہیں کہ دنیا میں (Fundametnalism) کا مقابلہ کیا جائے، یعنی کوئی اصول ہی باقی نہ رہے، حدود ہی باقی نہ رہیں، وہ سب کر سکتے ہوں جس سے دل خوش ہو جائے۔

(۱) سورۃ القصص ۸۳

ان سب خطرات کو سامنے رکھنا چاہیے، اب معاملہ صرف اتنا نہیں ہے کہ شیعیامت جاؤ، بہت بری بات ہے، اس کی برائی اپنی جگہ پر مسلم ہے، جو شناعت ہے وہ شناعت ہے، اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا، اب صرف یہ نہیں کہ کھیل کود میں زیادہ مت پڑو، فضول خرچی مت کرو، اب یہ اصلاح معاشرہ کا کام بہت اہم ہے، میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ایک رکن کی حیثیت سے اس کی پوری وکالت کرتا ہوں، یہ کام آپ کو کرنا ہے اپنی اپنی جگہوں پر، اصلاح معاشرہ کی دعوت دینا ہے، مکاتب و مدارس کو جاری کرنے کی آپ کو دعوت دیتا ہے، ہر مسجد میں مکتب قائم ہو اور کچھ گھروں پر بھی اس کا انتظام ہو جیسے پہلے ہوا کرتا تھا، کوئی پڑھے لکھے آدمی بیٹھیں اور وہاں سے بچے آئیں اور اردو لکھنا پڑھنا سیکھیں، قرآن مجید پڑھ سکیں، اور جو دینیات کی بنیادی باتیں ہیں مثلاً کلمہ ان کو صحیح یاد ہو اور وہ شرک و توحید کا فرق سمجھتے ہوں، کفر و ایمان کا فرق سمجھتے ہوں، اور سیرت نبوی سے ضروری حد تک واقف ہوں، یہ سب کام آپ کو کرنا ہے۔

لیکن ان سے بڑی ایک گہری سازش اس وقت ہے جس کے لیے بڑے پیمانے پر آپ کو عملی تیاری کرنی ہے، وہ ہے عدم اصول پرستی کے خلاف جہاد، اس وقت مغرب نے خاص طور پر جو مہم چلائی ہے اور ایک بہت بڑی سازش اور ایک بہت بڑا منصوبہ ہے، اس میں یہودی دماغ کام کر رہا ہے، اور عیسائی وسائل اور عیسائی طاقتیں اس کے پیچھے ہیں، وہ یہ ہے کہ اس وقت سارے عالم میں عقیدہ کو، ایمان کو، تعلق باللہ کو، ایک دین کی پابندی کو اور آخرت کے خیال کو متزلزل کریں، اور یہ کہہ کر کہ یہ سب بنیادی باتیں ہیں، پرانی باتیں ہیں، فرسودہ باتیں کہتے ہیں، تو اس کے لیے (Fundamentalism) وغیرہ کے نام رکھتے ہیں، اس کے لیے آپ کو تیاری کرنا ہے۔

"الاصلاح" محض تقریر و تحریر کا شعبہ نہیں

میں "الاصلاح" کو محض تقریر و تحریر کا ایک شعبہ نہیں سمجھتا، بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ندوۃ العلماء کے ایک مقصد کے پورا کرنے کا یہ ایک ذریعہ ہے، اور وہ ہے ذہین اور تعلیم یافتہ حلقوں کو مطمئن کرنا، اسلام پر اعتماد دوبارہ دلانا اور خاص طور پر ترقی یافتہ جو اسلامی ممالک ہیں،

ان میں اسلام پر اعتماد متزلزل ہو چکا ہے۔ الجزائر میں کیا ہو رہا ہے؟ الجزائر میں خالص
دینداروں اور حکومت کے نمائندوں کے درمیان جنگ ہے، نہ اسرائیل کی ان کے خلاف
جنگ ہے، نہ اسرائیل کا ان کے خلاف معرکہ ہے، اور نہ کسی یورپین طاقت کی ان کے خلاف
جنگ ہے، اور نہ ملک میں بگاڑ و فساد پیدا کرنے والوں کے درمیان، خالص دیندار، دین
پسند، جنہیں دین پرست نہیں کہنا، دین پسند طبقے اور جو چاہتے ہیں کہ کلمۃ اللہ ھی العلیا اس
پر عمل ہو، یہاں اللہ کا نام بلند ہو، یہاں اللہ کا نام سب سے اونچا ہو، اللہ کا حکم سب سے زیادہ
قابل اطاعت سمجھا جاتا ہو، یہاں فرائض کی پابندی ہو، اور محارم سے، محرمات سے اجتناب
ہو، یہاں مسجدیں آباد ہوں، اس کا ذکر کرنا بھی الجزائر میں ایک بڑا جرم ہے، روز خبریں آتی
رہتی ہیں کہ دین پسند لوگوں میں سے اتنے آدمی شہید ہوئے، لیبیا میں بھی ہو چکا ہے، اور اب
بھی لیبیا کا حال وہی ہے، اور شام تو بالکل غیر مسلم عنصر کے قبضہ میں ہے، وہاں کے دروزی
حقیقت میں وہ مسلمان نہیں ہیں، کسی طور پر ان پر مسلمانوں کی تعریف صادق نہیں آتی، اس
طور پر یہ فتنہ مشرق کی طرف بڑھ رہا ہے، اور ہمیں اندیشہ ہے کہ پاکستان بھی اس کی لپیٹ
میں نہ آ جائے، اور ضیاء الحق شہید مرحوم کی شہادت اور ملک فیصل کی شہادت میں بھی امریکہ
کا ہاتھ تھا، اور وہ اس بنا پر تھا کہ کوئی ایسا شخص یا ایسا فرد غالب نہ ہونے پائے، حاوی نہ
ہونے پائے اس ملک پر، اس ملک کے مستقبل کی تعمیر میں وہ آزاد نہ ہو، جو اصول پسند ہو اور
عقیدہ کا پختہ ہو اور اسلام کی ابدیت پر پورا یقین رکھتا ہو، اور ضروری حد تک وہ فرائض کا بھی
پابند ہو، یہ ایک سازش چلی آ رہی ہے فکری طور پر بھی اور سیاسی و انتظامی طور پر بھی، اخلاقی
طور پر بھی، جیسی بھی طور پر اس کا مقابلہ کرنا اور تعلیم یافتہ طبقہ کو مطمئن کرنا اور اسلام کی
ابدیت پر اس کا یقین واپس لانا، دوبارہ یقین پیدا کرنا ہے، اسلام ہر زمانہ کا ساتھ دے
سکتا ہے، قیادت کر سکتا ہے۔

اس زمانہ کا اصل فتنہ

جدید نظام تعلیم اور یورپ سے جو طریقہ تعلیم آیا ہے، وہاں سے امپورٹ کیا گیا ہے،

اس میں یہ خاصیت ہے کہ وہ اسلام پر اعتماد کو متزلزل کردے کہ اسلام نے بیشک ایک زمانہ میں اچھا کام کیا تھا، اچھا پارٹ ادا کیا تھا، لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے، اس وقت وہ بہت ہی غیر ترقی یافتہ زمانہ تھا، خدا بھلا کرے ان لوگوں کا، مثلاً عورت کے کچھ حقوق مل گئے، دختر کشی بند ہوگئی، اور شراب اتنی نہیں پی جانے لگی، لیکن اب اسلام اس زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتا ہے۔

آپ کو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ اسلام اس زمانہ کا ساتھ دیتا تو الگ رہا، یہ تو اس تنزل کے بعد اس زمانہ کو ہلاکت سے بچا سکتا ہے، اسلام اس زمانہ کو راہ پہ لگا سکتا ہے، اسلام اس زمانہ کو مبارک بنا سکتا ہے اور اسلام اس زمانہ کو رہنے کا سلیقہ سکھا سکتا ہے، اس کے لیے آپ کو تیاری کرنی ہے، بہتر ہوگا کہ ہمارے بعض اساتذہ اس میں کتابوں کا انتخاب کریں۔

کتابوں کا مطالعہ

ایک زمانہ میں ہم نے مولانا مسعود عالم صاحب ندوی سے مشورہ کر کے ایک فہرست بنائی تھی کہ فلاں درجے سے لے کر فلاں درجہ کے طلبہ یہ کتابیں پڑھیں، اور فلاں درجے سے فلاں درجہ تک کے طلبہ یہ کتابیں پڑھیں، اور ہم نے یہ بھی انتظام کیا تھا کہ "الاصلاح" میں ایک رکن کی ڈیوٹی مقرر کی تھی کہ آپ یہاں بیٹھا کریں، "الاصلاح" کے کھلنے کا جو وقت ہے اس میں ایک گھنٹہ آپ وقت دیں کہ طلبہ کو معلوم ہو کہ ان سے پوچھا جا سکتا ہے کہ کون سی کتابیں پڑھنی ہیں، طلبہ ان کے پاس جائیں اور کہیں کہ ہم اس درجہ کے طالب علم ہیں، بتائیے ہم پہلے کیا پڑھیں؟ بتائیے ہم تاریخ کا مطالعہ کہاں سے شروع کریں؟ بتائیے ہم سیرت میں اس وقت کون سی کتابیں پڑھیں؟ اس منزل پر کون سی کتاب مناسب ہوگی؟ یہ وہ انتظامات ہم لوگوں نے کیے تھے، ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیے۔

میں نے اتنی طوالت اور اتنی تفصیل کے ساتھ بات کر دی، حالانکہ میں اس حال میں نہیں تھا، اور میں آپ سے معذرت کرنے والا تھا، کہ مجھے بعض ضرورتیں ہیں، ہمارے معزز مہمان بھی آنے ہوئے ہیں، ذہن دوسری لائن پر کام کر رہا ہے، لیکن یہ آپ کی محبت ہے، آپ کا خلوص ہے، یا اللہ تعالیٰ جو آپ سے کام لینا چاہتا ہے، اس کی اہمیت اور قدر و قیمت

ہے کہ میں نے اتنی تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کیا۔

بس آخر میں یہ کہنا ہے کہ "انجمن الاصلاح" کو محض آپ تحریر وتقریر کی مشق، مضمون نگاری سیکھنے کی جگہ نہ سمجھیں، بلکہ یہاں سے آپ کو وہ ذخیرہ لینا ہے، وہ مواد لینا ہے کہ جس سے آپ یہاں سے نکلنے کے بعد جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو انٹلیکچول کلاس (Intellectual Class) کہلاتا ہے، ذہین طبقہ جو ہے، آپ اس کو مطمئن کر سکیں، اس میں اسلام کی ضرورت کا احساس پیدا کر سکیں اور اسلام کے بارے میں اعتماد واپس لا سکیں۔

یہاں سے لے کر انڈونیشیا اور مغرب اقصیٰ اور مراکش تک ان سب جگہوں پر اس وقت جو زور ہے وہ یہ کہ امریکہ اور یہودیوں اور عیسائیوں کی سازش سے ان سب جگہوں تک جراثیم پہنچ گئے ہیں کہ اسلام پر اعتماد متزلزل ہو جائے اور اسلام پر عمل کرنے کو وہ قدامت پسندی اور رجعت پسندی اور (Fundamentalism) سے تعبیر کرنے لگیں اور ایک پڑھے لکھے آدمی کو شرم آنے لگے کہ ہم بنیاد پرست (Fundamentalist) نہیں ہیں، آپ کو وہ کام کرنا ہے کہ لوگوں سے یہ اعلان کرا دیں اور آنکھیں ملا کر یہ کہیں کہ ہاں ہم (Fundamentalist) ہیں، دوسرے نہ ہوں۔ یہ (Fundamentalist) ہی دنیا کو بچا سکتا ہے، اور ساری خرابی اور سارا فساد (Fundamentalism) نہ ہونے کی وجہ سے ہے، کوئی اصول نہیں، کوئی معیار نہیں، کوئی حد نہیں، صرف نفس پرستی ہے، صرف خواہش پرستی ہے، صرف اقتدار پرستی ہے، صرف سیاست پرستی ہے، اس نے آپ کو بھی بیمار کر رکھا ہے۔[۱]

(۱) انجمن الاصلاح طلبہ دار العلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کے افتتاحی جلسہ میں ۲ ربیع الاول ۱۴۱۳ھ کو کی گئی تقریر، یہ تقریر بہ تقاضا ... تمہید کی، ماخوذ از "تعمیر حیات" لکھنؤ (شمارہ ۲۵ جون ۱۹۹۲ء)۔

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیِ احرار

یہ وہ مجدد صاحب ہیں جو بدعت حسنہ کے بھی قائل نہیں تھے، آپ کو ان کے ایک مکتوب کا اقتباس سناتا ہوں، جس میں دین کی حمیت اور شریعت کے بارے میں ان کی غیرت و حمیت بہت صاف نظر آتی ہے۔

ایک معاصر نے اپنے خط میں شیخ عبدالکبیر یمنی کی (جو غالباً شیخ محی الدین ابن عربی اور بعض مشائخ تصوف سے متاثر تھے) کچھ ایسی تحقیق لکھی جو اہل سنت والجماعت اور اجماع امت کے خلاف تھی، حضرت مجدد صاحب نے اس کے جواب میں جو طویل مکتوب لکھا، اس کی تلخیص یہاں نقل کرتے ہیں۔

"مخدوما! این فقیر تاب استماع این چنیں کلمات ندارد، بے اختیار رگ فاروقیم در حرکت می آید، شیخ عبدالکبیر یمنی باشد یا شیخ اکبر محی الدین ابن عربی، مارا محمد عربی در کار است نہ ابن عربی، فتوحات مدنیہ از فتوحات مکیہ مستغنی ساختہ اند، مارا بہ نص کار است نہ بہ فص۔" [1]

شیخ محی الدین ابن عربی جن کے ذریعہ وحدۃ الوجود کا عقیدہ تمام دنیا میں پھیلا، اور بڑے بڑے عارفین باللہ اور بڑے بڑے مشائخ ان کے قائل ہی نہیں، بلکہ اس پر معتقد تھے، ان کی دو کتابیں ہیں، ایک فتوحات مکیہ ہے، جس میں انہوں نے وحدۃ الوجود کے عقیدہ کی صاف صاف تبلیغ کی ہے، اور اس کو پیش کیا ہے، دوسرے فصوص الحکم۔

مجدد صاحب فرماتے ہیں:-

"مخدوما! اس طرح کی باتوں کے سننے کی میرے اندر تاب ہی نہیں، بے اختیار میری رگ فاروقی حرکت میں آجاتی ہے، اور تاویل و توجیہ کا موقع نہیں دیتی، ایسی باتوں کے قائل

---

(۱) مکتوب ۱۰۰ امام ربانی حصہ اول

شیخ کبیر بنی ہوں یا شیخ اکبر ثانی، انہیں کلام محمد عربی (علیہ وعلی آلہ الصلاۃ والسلام) درکار ہے، نہ کہ کلام محی الدین ابن عربی، صدر الدین قونوی، اور شیخ عبدالرزاق کاشی، ہم کو نص سے کام ہے، نہ کہ فص سے، فتوحات مدنیہ نے فتوحات مکیہ سے مستغنی بنا دیا۔"

یہ سب مجدد صاحبؒ کا فیض ہے

جس وقت ہندوستان کے تخت پر ۹۶۴ھ میں جلال الدین اکبر بیٹھا ہے، اسلام کو آئے ہوئے ایک ہزار سال ہو رہے تھے، ایرانیوں کی ایک جماعت نے ایک گہری سازش کی کہ پوری دنیا کو یہ باور کرائیں کہ اسلام اور دین محمدی کا دور ختم ہو گیا، اس جماعت نے یہ اصول اکبر کے ذہن نشین کرا دیا کہ ہر مذہب کی عمر ایک ہزار (۱۰۰۰) سال ہوتی ہے، یہودیت ہزار سال رہی پھر ختم ہوگئی، عیسائیت ختم ہوئی، پھر اسلام آیا، اب اس کو ایک ہزار سال ہو رہے ہیں۔

اس جماعت نے اچھی طرح سے سمجھا کہ اس بات کو قبول کرانے اور اس کو پوری طاقت سے نافذ کرنے، ۱۰۰۰ھ ہوسکتا ہے ہو گیا، وہ چھا گئے اور منتشر ہو گئے، اس جماعت نے اکبر کا انتخاب کیا جس کی سمجھ میں ان کی یہ بات آگئی اور وہ الحاد کے راستے پر پڑ گیا، وہ برہمنوں، پنڈتوں اور علماء کو جمع کرا کے بحث کرواتا تھا، پھر لادینیت کو تسلیم کیا جاتا تھا۔

ایسے نازک وقت میں مجدد صاحبؒ اور ان کا خاندان سامنے آتا ہے، اس خاندان نے اس ملک کو اس خطرہ سے محفوظ کر دیا کہ یہاں لادینیت کا دور دورہ ہو جائے، اسلام کا رشتہ اس ملک سے کٹ جائے اور دینی حس ختم ہو جائے۔

میں آپ سے صاف کہتا ہوں، اور خانۂ خدا میں بیٹھ کر کہتا ہوں کہ اس ملک میں دین عقیدہ اور جو کچھ بھی صحیح شکل میں پایا جاتا ہے، اس میں بڑا حصہ حضرت مجددؒ صاحب اور ان کے خاندان کا ہے۔

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے تقریر کرتے ہوئے ایک بار فرمایا کہ لوگ اس تاریخی حقیقت پر غور نہیں کرتے، سرسری انداز میں گزر جاتے ہیں کہ عام طور

پر جب بادشاہ جاہل ہو، مخالف دین ہو، اس میں کوئی خرابی ہو تو اس کے بعد اس کا جو جانشین آتا ہے وہ اس سے بدتر ہوتا ہے، وہ اس میں اپنی سعادت سمجھتا ہے کہ اپنے والد اور سابق بادشاہ کے طریقہ پر قائم رہے، لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ اکبر کے بعد جب جہانگیر ہوا تو وہ اس سے بہتر ہوا، دین پر قائم رہا، اور بعد میں حضرت مجدد صاحب کا معتقد بھی ہو گیا تھا، پھر جہانگیر کے بعد شاہ جہاں ہوا تو اس سے بہتر تھا، وہ جب تخت طاؤس پر بیٹھا جو بڑے فخر کی بات تھی تو وہ اتر گیا، نماز پڑھی اور سجدہ کیا اور کہا کہ فرعون جو کم عقل اور کم ظرف تھا کہ مصر کے تخت پر بیٹھا اور خدائی کا دعویٰ کر بیٹھا، میں تخت طاؤس پر بیٹھ کر سجدہ کرتا ہوں، شاہ جہاں کے بعد اورنگ زیب عالم گیر ہوا (جن کو ہمارے فاضل دوست و ادیب شیخ علی الطنطاوی چھٹے خلیفۂ راشد سے تعبیر کرتے ہیں، ان کے نزدیک حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے بعد پورے عالم اسلام میں عالم گیر جیسا متبع سنت، صاحب حمیت اور اسلامی قانون اور اسلامی شریعت کا جاری کرنے والا پیدا نہیں ہوا) اس میں جو راز ہے وہ یہ کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور ان کا خاندان اندر اندر کام کر رہا تھا، اور متاثر کر رہا تھا، حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ جو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ممتاز ترین فرزند تھے، اور جن سے ان کا سلسلہ پھیلا ہے، وہ عالم گیر کو شہزادگی کے دور میں جب خط لکھتے تو انہیں "شہزادۂ دین پناہ" سے خطاب کرتے۔

اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ دارالعلوم ندوۃ العلماء اور صحیح الفکر و صالح دعوت مدارس و مراکز باقی رہیں گے، اور اگر خدا کو ان کی حفاظت مطلوب اور محبوب ہے تو حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے راستہ پر رہیں گے، اگر یہ دارالعلوم دونوں کے راستہ سے ہٹا تو یہ دارالعلوم وہ دارالعلوم نہیں ہوگا، جس کی بنیاد حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ، مولانا سید ظہور الاسلام فتح پوریؒ، مولانا سید عبدالحی رائے بریلویؒ، مولانا خلیل الرحمن صاحب سہارنپوریؒ، منشی اطہر علی کاکوروی اور مولانا شبلی نعمانیؒ نے ڈالی تھی، یہ بات آپ یاد رکھیے کہ یہ دارالعلوم حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے راستہ پر ہے۔

امتیازی خصوصیات

عزیزو! آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان دونوں کے طریقۂ عمل، ان کی دعوت، ان کی تحریک اور ان کی جد وجہد کی چند امتیازی خصوصیات ہیں:

(۱) عقیدۂ اسلام: سب سے پہلے اس اسلامی عقیدہ کو پورے طور پر قبول کیا جائے جو صحابۂ کرام کا عقیدہ تھا، جو مجتہدین عظام، اکابر علماء اور مجددین امت و مصلحین کا عقیدہ تھا۔

(۲) دوسری بات ہے اشاعت دین، یعنی اس دین کی اشاعت وتبلیغ کی جائے۔

(۳) اور تیسری بات جو ان دونوں حضرات کی خصوصیت ہے، وہ حمایت دین کا جذبہ، حمیت دینی ہے، بہت سے ایسے حضرات ہیں، ہم ان کی قدر کرتے ہیں، احترام کے ساتھ ہم ان کا نام لیتے ہیں، ان کے یہاں اشاعت دین کا جذبہ تھا، لیکن وہ چیز جس کو دینی غیرت وحمیت کہتے ہیں، وہ ان کے یہاں یا ہم کو ان کے حالات میں زیادہ نمایاں نہیں معلوم ہوتی، ان دونوں حضرات کی خصوصیت یہ ہے کہ اشاعت دین کے ساتھ حمیت دینی بھی تھی، یہ بہت اہم چیز ہے، کہ دین کے خلاف، اسلام کے منافی کوئی چیز برداشت نہ ہو، اس کو قبول نہ کیا جائے بلکہ نہ پیدا ہونے پائے، اور اس کا ایک سخت، کڑا اور شدید ردعمل ہو جائے، یہ بات دوسرے حضرات میں بھی تھی، لیکن ان دو حضرات میں سب سے نمایاں تھی۔

شاہ ولی اللہؒ کی خصوصیت اور ان کے کارنامے

حضرت شاہ صاحبؒ نے ہماری معلومات کے مطابق سب سے پہلے ہندوستان میں حدیث شریف کی تدریس کا سلسلہ شروع کیا، وہ حجاز گئے اور وہاں عرب اساتذہ سے انہوں نے حدیث پڑھی اور اس کی سند حاصل کی، پھر یہاں آکر انہوں نے حدیث کا درس شروع کیا، ہماری محدود معلومات کی حد تک صحاح ستہ کی تدریس کا رواج اس سے پہلے ہندوستان میں نہیں تھا، یہ کام حضرت شاہ صاحب نے شروع کیا، آپ کسی عالم سے حدیث پڑھیے اور سند لیجیے تو یہ سلسلہ شاہ ولی اللہ تک پہنچتا ہے، پھر حرمین اور حجاز کا سلسلہ ہے، خاص طور پر محققین

کا درس، پھر ان کی شرح و تفسیر کا کام اور ان کی خدمت۔

ان کا دوسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے قرآن مجید کے تراجم کا سلسلہ شروع کیا، یہ بات شاید بہت سے لوگوں کے لیے انکشاف ہوگی کہ یہاں کے بہت سے علماء قرآن مجید کا دوسری زبانوں میں ترجمے کو خطرناک سمجھتے تھے، اس کی دو وجہ تھی، ایک تو یہ کہ جو اہل دنیا ہوتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ اس سے ہماری قدر ہماری روانی چلی جائے گی، ہماری سرداری اور ہمارے مطاع ہونے کی جو حیثیت ہے، اور ہماری بات کو اللہ و رسول کی بات کی طرح لوگ سمجھتے ہیں، ہماری یہ حیثیت ختم ہو جائے گی، ہماری خیریت اسی میں ہے کہ قرآن مجید کا ترجمہ یہاں کی زبانوں میں نہ ہو، اپنے دنیا پرست علماء قرآن مجید کے ترجمہ کو بدعت بتاتے ہیں، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔

شاہ صاحب نے اس کی طرف توجہ کی، ان کے دونوں صاحبزادوں نے اردو میں ترجمے کیے، ایک شاہ رفیع الدین کا ترجمہ جو لفظی ہے، اور ایک شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ جو بے نظیر ہے، اس میں خاص اللہ تعالیٰ کی مدد معلوم ہوتی ہے، اگر وقت ہوتا تو میں تفصیل سے آپ کو مثالیں دے کر بتاتا۔

یہاں صرف دو مثالیں دیتا ہوں، قرآن مجید میں ہے: ﴿وَقَالُوا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ إِنَّا لَنَحْنُ الْغَالِبُونَ﴾[1] زمخشری جیسے ادیب مفسر کو بھی "عزۃ" کا مفہوم ادا کرنے میں دشواری پیش آئی ہے، عام طور پر اس کا ترجمہ "فرعون کی عزت" "فرعون کا غلبہ" کے الفاظ سے ادا کیا جاتا ہے، شاہ صاحب جو دہلی کے رہنے والے تھے، وہ درباری زبان سے واقف تھے، اور محاوروں کو بھی جانتے تھے، وہ خود فرماتے تھے کہ جب کسی آیت کا ترجمہ سمجھ میں نہیں آتا تو بازار چلا جاتا تھا، لوگوں کی باتیں سنتا کہ وہ کس طرح اس مفہوم کو ادا کرتے ہیں، شاہ صاحب نے "بعزۃ فرعون" کا ترجمہ اس طرح کیا ہے: "فرعون کے اقبال سے ہم ہی غالب ہوں گے" درباریوں اور خوشامدیوں کی زبان ایسی ہی ہوتی ہے۔

---

(1) سورۃ الشعراء: ۴۴

شاہ صاحب نے اپنے ترجمہ میں صوتی آہنگ کا بھی خیال رکھا ہے، چنانچہ فَدَمَّرۡنٰھُمۡ تَدۡمِیۡرًا[1] کا ترجمہ کیا ہے: "جب اکھاڑ مارا ان کو تھا کر"۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا تیسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے توحید خالص پر بہت زیادہ زور دیا، ان کے پوتے حضرت شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ نے کتاب "تقویۃ الایمان" لکھی، جس سے زیادہ صاف، واضح اور طاقتور کتاب توحید کے موضوع پر ہمارے علم میں نہیں، اس کتاب کے بارے میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فرماتے تھے کہ اس سے ہزاروں نہیں لاکھوں لوگوں کو ہدایت ملی ہے، حضرت علمائے دیوبند و مظاہر علوم اور علمائے ندوہ سب اس کے قائل تھے۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نے (اللہ ان کے درجات بلند فرمائے) ہمیں اس کتاب کے عربی میں ترجمہ کا حکم دیا، ہم مدینہ منورہ میں تھے، جانا بھی تھا، گاڑی مسجد نبوی کے دروازہ مجیدی پر کھڑی تھی، سامان رکھا جا چکا تھا کہ نماز پڑھیں اور روانہ ہو جائیں، حضرت شیخ الحدیث نے پیغام بھیجا کہ ترجمہ کا کام شروع کر کے جائیں، ہم نے روضۃ من ریاض الجنۃ میں عزیزی محمد واضح سلمہ کو سامنے بٹھا کر ترجمہ کا کام شروع کر دیا۔ ہمیں صاف معلوم ہوا کہ یہ کتاب عند اللہ و عند الرسول مقبول ہے، جو کچھ لکھا تھا وہ حضرت شیخ کو سنایا گیا، حضرت نے سن کر بڑی دعائیں دیں، جب اس کتاب کا ترجمہ "رسالۃ التوحید" کے نام سے مکمل ہو کر شائع ہو گیا تو ہم نے ایک بڑے سعودی عالم جو جامعہ اسلامیہ کے استاذ بھی تھے، ان کو یہ کتاب پڑھنے کو دی، عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ شیخ محمد بن عبد الوہابؒ کی کتاب "کتاب التوحید" سب سے بڑھی ہوئی ہے، اور ان کے متبعین تو اس کے سوا کسی کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں، لیکن انہوں نے سعودی اور "وہابی" ہونے کے باوجود صاف صاف کہا کہ "یہ تو توحید کی منجنیق ہے، یہ تو [تجھ کو بلا دیں] کر لی ہے"۔

تو شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور ان کے خاندان نے توحید خالص، قرآن کی اشاعت اور

---

(۱) سورۂ فرقان

حدیث شریف کی خدمت انجام دی، آج اس ملک میں جہاں بھی حدیث شریف پڑھائی جاتی ہے، وہ سب شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور ان کے خاندان کا فیض ہے۔

شاہ صاحب نے اس پر اکتفا نہیں کر لیا، بلکہ انھوں نے اپنی خداداد فراست سے محسوس کیا کہ اب جو دور آنے والا ہے وہ عقلی دور ہوگا، عقلی طور پر متاثر کرنے والا دور ہوگا، اس کے لیے انھوں نے "حجۃ اللہ البالغۃ" جیسی بے نظیر کتاب لکھی، جو جدید علم کلام کا بہترین نمونہ ہے۔

یہ بات بہت کم لوگوں کے علم میں ہے کہ جہاد کی تحریک شاہ صاحبؒ ہی کے زمانہ سے شروع ہوئی، مرہٹوں کا مقابلہ کرنے کے لیے (جن سے دلی کے مسلمانوں کی جان اور عزت محفوظ نہیں تھی) شاہ صاحبؒ نے احمد شاہ ابدالی کو افغانستان سے بلایا، جس نے مرہٹوں کو ایسی شکست فاش دی کہ تاریخ میں لکھا ہے کہ مرہٹواڑہ میں کوئی گھر نہیں بچا جہاں ماتم نہ ہوا ہو، سب سے پہلے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتوی دیا۔

ٹیپو سلطان شہیدؒ کا بھی روحانی تعلق حضرت سید احمد شہیدؒ کے خانوادہ سے تھا۔ انگریزوں کے حقیقی خطرہ کا ادراک سلطان ٹیپو نے کیا، اس کے خاندان کا تعلق روحانی حضرت سید احمد شہیدؒ کے نانا شاہ ابوسعیدؒ حسنی کے چچا سید نعمانؒ خاص طور سے شاہ ابواللیثؒ سے تھا، جو سید صاحب کے حقیقی ماموں تھے۔

عزیزو! ایک جسمانی نسب نامہ ہوتا ہے، ایک علمی و دینی نسب نامہ ہوتا ہے، اور ایک اعتقادی نسب نامہ ہوتا ہے۔ آپ اس علمی و فکری نسب نامہ کو ہمیشہ یاد رکھیے، اس نسب نامہ کو آپ نہ یہاں بھول لیے اور نہ اپنے گھر جا کر بھولیے کہ ہم سب حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے خاندان کے فیض یافتہ اور ان کے تربیت یافتہ ہیں۔

نئے دور کے فتنوں کے مقابلہ میں ندوۃ العلماء کا کارنامہ

عزیزو! ندوۃ العلماء نے اپنے قیام کے بعد ہی سے وقت کے فتنوں کو نہ صرف پہچانا،

بلکہ ان کا مقابلہ بھی کیا، ان فتنوں میں قادیانیت، عیسائیت کے فتنے تھے، جن کا مقابلہ بانیِ
ندوۃ العلماء مولانا سید محمد علی مونگیریؒ نے کیا۔ ہم نے خود یہ واقعہ مونگیر میں سنا کہ جب
قادیانیوں کا بہار میں خطرہ محسوس ہوا تو مولانا سید محمد علی مونگیریؒ نے مولانا مرتضیٰ حسن چاند
پوریؒ کو قادیانیوں سے مناظرہ کے لیے مدعو کیا، ادھر مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری قادیانیوں
سے مناظرہ کر رہے تھے، ادھر مولانا سید محمد علی مونگیریؒ سجدہ میں دعا و گریہ زاری میں مصروف
تھے، یہاں تک کہ کسی نے آکر سنایا کہ قادیانیوں کو شکست ہوئی اور جوتے چھوڑ چھوڑ کر بھاگ
رہے ہیں، تب جاکر مولانا سید محمد علی مونگیریؒ نے سجدہ سے سر اٹھایا۔

دوسرا فتنہ "روشن خیالوں" کا تھا جنہوں نے ایک بڑا ادارہ قائم کیا اس جماعت کے
لکھنے والوں نے دین کے حقائق کو بدل کر پیش کیا، اس کی وجہ سے اسلامی عقیدہ میں ایک
تزلزل اور خطرہ پیدا ہوا، ان روشن خیالوں کا سب سے بڑا نشانہ غیبی حقائق اور معجزات تھے، وہ
معجزات کی ایسی تاویل کرتے کہ وہ معجزہ ہی نہ معلوم ہوتا، اپنی تفسیروں میں انھوں نے خاص
طور سے اس پر زور دیا۔

ندوۃ العلماء نے اس طبقہ کو راہ راست پر لانے کے لیے اپنے نصاب میں انگریزی کا
اضافہ کیا، اس کے ساتھ اس نے اس بات پر بھی زور دیا کہ نئے اسالیب بیان اور نئے طرز فکر
سے طلبہ واقف ہوں، اور کون سا فتنہ کہاں اٹھ رہا ہے؟ اور کیوں یہ فتنے اٹھ رہے ہیں؟ اور کس
زبان اور اسلوب میں اٹھ رہے ہیں؟ ان سے واقف ہوں۔

ان روشن خیالوں کے مقابلہ کے لیے علامہ شبلیؒ کا قلم چلا، پھر مولانا سید سلیمان ندویؒ
اور مولانا عبدالباری ندویؒ کا قلم چلا، پھر تو ندوی فضلاء نے ان فتنوں کا بھی تعاقب کیا جو عالم
عربی میں قومیت عربیہ اور تجدد و تحرر کے نام سے اٹھے تھے۔

ندوۃ العلماء کے بانیوں اور مؤسسین نے ہمیشہ نصاب کو "وسیلہ" سمجھا، "غایت" نہیں، اور
غایت و مقصد میں ترمیم نہیں ہوتی، لیکن وسیلہ میں ترمیم ہوتی ہے، دور ثانی میں بھی برابر
ترمیم ہوتی رہی، ہمارے والد صاحب مولانا حکیم سید عبدالحئیؒ کا زمانہ، نظامت "ہندوستان کا

نصاب درس اور عہد بعہد اس کے تغیرات'' کا آپ مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ کس دور میں کون سی کتاب پڑھائی جاتی تھی، اور کب اس میں تبدیلیاں ہوئیں، اس طرح ندوۃ العلماء نے اپنے نصاب میں تاریخ اور جغرافیہ کا بھی اضافہ کیا۔

عربی زبان کی تدریس ایک زندہ زبان کی حیثیت سے

عزیزو! ندوۃ العلماء کے بانیوں اور اس کے روشن ضمیر کارکنوں نے اس وقت یہ محسوس کر لیا کہ اب تک دینی مدارس میں عربی زبان اس حد تک پڑھائی جا رہی ہے کہ تفسیر و حدیث اور فقہ کی کتابیں سمجھ سکیں (اللہ تعالیٰ ان مدارس کے بانیوں کی محنتوں اور کوششوں کو قبول فرمائے) لیکن اب جو دور آنے والا ہے، اس میں اس سے کام چلنے والا نہیں ہے، اب تو عربی زبان کو ایک زندہ زبان کی حیثیت سے کہ وہ دعوت اور تصنیف و تقریر کی بھی زبان ہے، پڑھایا جانا ضروری ہے، اس زمانے میں ہندوستان کا عالم عرب سے زیادہ تعلق بھی نہیں تھا، صرف حجاج کی حجاز آمد و رفت رہا کرتی تھی۔ حیرت ہوتی ہے کہ مولانا سید محمد علی مونگیریؒ نے حجاز کے دوران قیام میں ہمارے والد صاحب کو خط لکھا تھا کہ یہاں ایک عالم جن کو عربی پر بڑی قدرت ہے، عربی میں اچھی تقریر کرتے ہیں، میں ان کو راضی کر رہا ہوں، کہ وہ دارالعلوم جائیں، اور وہاں عربی زبان کا درس دیں، آپ اس کا خیال رکھیے کہ طلبہ کو عربی زبان میں مہارت پیدا ہو، اور اس میں وہ تقریر کر سکیں۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے بھائی صاحب ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبد العلی صاحبؒ کی نگرانی و ہدایت پر ندوۃ العلماء نے عربی کے ابتدائی نصاب کی ترتیب کا کام شروع کیا، جو اس کے بنیادی مقاصد میں سے ایک تھا، اور وہ عالم عربی میں بھی مقبول اور کہیں کہیں رائج ہوا۔

اپنی استعداد کیسے مضبوط بنائیں؟

عزیزو! دنیا کی تمام زبانوں میں عربی زبان سب سے زیادہ حساس، ذکی الحس اور غیرت مند زبان ہے، ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ قرآن کی زبان ہے، پیغام الٰہی کی زبان ہے،

تعلیمات نبویؐ کی زبان ہے، اس کے علاوہ دو چیزیں اور ہیں، ایک اعراب جو کسی اور زبان میں نہیں، دوسرے مختلف المخارج اور مختلف الاصوات حروف جو دوسری زبان میں نہیں، ذرا سی غلطی سے، زیر کو زبر اور منصوب کو مجرور پڑھئے اور 'ث' کو 'س' کی طرح بولنے سے سب پر پانی پھر جائے گا، آپ ایسی استعداد بنائیے کہ صحیح اعراب پڑھ سکیں، اور صحیح مخارج سے حروف کو ادا کر سکیں۔

ایک بار ہمیں جامعہ دمشق میں جس کا وائس چانسلر ایک عیسائی فاضل تھا اور جس کے جلسے میں مفتئ دمشق اور ممبران پارلیمنٹ شریک ہونے والے تھے، فلسطین کے قضیہ پر مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی گئی، ہم نے "العوامل الأساسية لنكبة فلسطين" (المیہ فلسطین کے بنیادی اسباب) کے موضوع پر مقالہ لکھا، اس کو جلسہ میں پڑھنے سے پہلے احتیاط کے طور پر علامہ بہجۃ البیطار کی خدمت میں گئے، اور عرض کیا کہ آپ ہمارے استاد مولانا سید سلیمان ندویؒ کے دوست ہیں، براہ کرم آپ ہمارا یہ مقالہ سن لیجیے کہ شاید کوئی غلطی ہو، انہوں نے فرمایا کہ نہیں، تم کو اس کی کوئی ضرورت نہیں، تم تو ماذا خسر العالم کے مصنف ہو، پھر بھی ہم نے ان کو اپنا مقالہ پورا سنا دیا، انہوں نے کہیں نہیں ٹوکا، ہم سے کہا کہ آپ 'الف لام' کا استعمال کرنے میں بہت محتاط ہیں، ہندوستانی علماء جا و بے جا 'الف لام' استعمال کرتے ہیں، پھر انہوں نے ایک لطیفہ سنایا کہ ایک ہندوستانی عالم ایک عرب عالم کے پاس آئے اور کہا کہ أنا ذاهب من المكة في مدينة، فهل لك حاجة؟ اس جملہ کو سن کر عرب عالم نے کہا کہ حاجتي الوحيدة أن تأخذ الألف واللام من مكة وتضعهما على المدينة، الف لام ان عالم صاحب نے مکہ پر لگا دیا، جبکہ اس پر الف نہیں آتا۔

ہم سے بعض عربوں نے شکایت کی کہ ہندوستان کے علماء ہمارے ملک آتے ہیں، مساجد میں ان کی تقریر کا اعلان ہوتا ہے، ہم بیٹھ جاتے ہیں، لیکن چند ہی جملوں کے بعد بیٹھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

آپ یہ نہ سمجھیں کہ آپ کو عرب ممالک نہیں جانا ہے، آپ کو جانا ہے، لیکن ملازمت

چراغ سے چراغ جلتے ہیں

عزیز طلبہ! مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اگر کوئی قیمتی سے قیمتی بات اور مخلصانہ سے مخلصانہ مشورہ ہو سکتا ہے تو اس کے مستحق آپ ہیں، آپ کا یہاں آنا خواہ آپ کی رضا اور آپ کے شعور سے نہ ہو، لیکن یہاں آپ کا طویل قیام، ہماری طرف انتساب اور ہمارے دارالعلوم کی طرف انتساب یہ تمام امور اس بات کے لیے کافی ہیں کہ ہم اپنے سینے میں اس عمر میں جو بہتر سے بہتر چیز رکھتے ہوں وہ پیش کریں، ہمارے اوپر شرعاً، اخلاقاً یہ ذمہ داری ہے اور ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ آپ کے سامنے بہتر سے بہتر مشورہ پیش کریں، کئی سال سے اس کے مواقع آتے رہے اور آپ سے کچھ کہنے کا اتفاق ہوتا رہا ہے۔ اور ہمیشہ میں دو تین باتوں پر خاص زور دیتا رہا ہوں۔ میں آج آپ سے صرف ایک بات کہوں گا، بقیہ چیزیں ان کو قصداً بیان نہیں کرتا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ سب باتیں بیکار ہیں، نہیں، وہ سب انتہائی مفید اور کارآمد ہیں لیکن یہ وقت اس کے لیے کافی نہیں۔

قانونِ الٰہی

اللہ تعالیٰ کے بہت سے قوانین ہیں جو ہزاروں لاکھوں برس سے چلے آرہے ہیں، اور ہم اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور ہزاروں برس سے اٹھاتے رہے ہیں، زمین سے فائدہ اٹھانے کا اور زراعت کا ایک قانون ہے، اس سے انسان خواہ وہ دینی معاملے میں کتنے ہی درجے کا ہو یا دنیاوی امور میں بڑے سے بڑا صاحبِ تدبیر اور بڑے سے بڑا صاحبِ شمشیر بادشاہ ہو، کوئی اس سے مستغنی نہیں ہو سکتا، وہ قانون ہے کہ پہلے زمین کو جوتیے، پھر اس میں

پر انھوں نے سینے سے لگایا پھر کہا: پڑھو، پھر آپ نے معذرت کی، پھر سینے سے لگایا، پھر کہا: پڑھو، پھر آپ نے معذرت کی، پھر سینے سے لگایا پھر کہا: پڑھو، تو آپ نے پڑھنا شروع کیا۔

دنیا کے تمام ماہرین نے اس کو سمجھ لیا ہے کہ انسانی زندگی کی تکمیل کے لیے محض معلومات کافی نہیں ہیں، معلومات اور ایجادات و انکشافات کی جو فراوانی اس وقت ہے وہ تاریخ کے کسی دور میں نظر نہیں آتی، لیکن تاریخ یہ بھی بتا رہی ہے کہ اخلاقی پستی جو اس وقت ہے وہ کبھی نہیں تھی، اور یہ بھی خدا کی قدرت ہے کہ یورپ جو ایجادات و انکشافات کا سرچشمہ ہے، جہاں معلومات کی سب سے زیادہ فراوانی ہے، وہیں اخلاقی پستی بھی سب سے زیادہ ہے، اگر علوم و فنون کے لحاظ سے دنیا میں یورپ سب سے بڑھا ہوا ہے تو اخلاقی لحاظ سے دنیا کا سب سے تاریک ترین خطہ بھی وہی ہے، انسانی زندگی کی تکمیل کے لیے کچھ عقائد چاہئیں، کچھ اصول و قوانین چاہئیں، اور کچھ مسلمات بھی ہونے چاہئیں، اور پھر ان اصول و قوانین اور مسلمات پر عمل کرنے کے لیے قوی محرکات کی ضرورت ہے، فطری دواعی اور جذبات کی ضرورت ہے، محبت اور جذبۂ ایثار کی ضرورت ہے، ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی ہونی چاہیے، کچھ ہونے اور حاصل کرنے پر آمادگی کا اظہار ہونا چاہیے، قربانی کا جذبہ چاہیے، اپنے اندر تواضع اور بے نفسی چاہیے، لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی صلاحیت ہونی چاہیے، ایک دوسرے سے تعاون ہونا چاہیے، اپنے مقصد میں فنائیت اور خود فراموشی کا جذبہ چاہیے، یہ سب چیزیں آپ کو صرف کتابوں سے نہیں مل سکتی ہیں، اگر صرف کتابوں اور علمی تحقیقوں سے حاصل ہو چکتیں تو آج یورپ کے مستشرقین میں دنیا کے سب سے بڑے محدث اور مفسر نظر آتے، آج غزالی اور ابن تیمیہ ہوتے بلکہ جنید اور ریحان ہوتے، یہ سب چیزیں اگر مل سکتی ہیں تو صرف ایک جگہ سے، اور وہ ہے انسان کا سینہ، اسی سے یہ تمام چیزیں اخذ کی جا سکتی ہیں اور اسی سے انسان انسان بن سکتا ہے۔

آپ تاریخ کے کسی دور کا مطالعہ کر لیجیے، کسی ادارے یا قوم کی تاریخ کو دیکھیے، آپ دیکھیں گے کہ آج جو کچھ نظر آ رہا ہے یہ سب انسان ہی کی کاریگری ہے، دنیا میں جتنے انقلابات آئے، جتنی تحریکیں اٹھیں، یہ سب انسان ہی کے ذریعے سے ہوا، یہ جذبات و

کیفیات صرف انسان سے انسان کی طرف منتقل ہو سکتی ہیں، خدا کے صحیفوں کو دیکھ لیجیے، اللہ کے عارف بندوں کی سوانح پڑھ لیجیے، اور پھر تاریخی شہادتوں کا مطالعہ کر لیجیے، آپ دیکھیے گا کہ جب بھی انسان انسان بنتا ہے وہ ہمیشہ انسان ہی سے بنتا ہے، جب تک اس پر باہر سے انسانی جذبات و کیفیات کا افاضہ نہ ہوگا، یہ سب کچھ نہ ہوگا۔

انسان کے اندر کانوں کے پتھروں کی طرح ہزاروں سال سے بہت سے جواہرات پوشیدہ ہیں، ہزاروں چٹانوں کے نیچے کچھ پتھر مدفون ہیں لیکن وہ انسان کے کام کے نہ ہو سکے، اس کی وجہ ایک ہے، اور وہ یہ کہ ان پر سورج کی کرنیں پڑنی چاہئیں، جب تک یہ کرنیں ان کو جگمگا نہ دیں ان کی کوئی قیمت نہیں، تاریخ میں آپ دیکھیے گا کہ اگر علم و ادب، فلسفہ و فکر کے ذریعے کوئی انسان بن سکتا تو آج دنیا کے یہ بڑے بڑے مفکرین، فلاسفر اور متکلمین الحاد کی وادیوں میں نہ بھٹکتے، وہ دنیا کے عظیم ترین انسان ہوتے۔

آپ ملا نظام الدین کو دیکھ لیجیے، آج ان کا درس نظامیہ عالم اسلام کے گوشے گوشے میں پھیلا ہوا ہے، ان پر جب ملا عبدالرزاق بانسوی کی کرنیں پڑیں تو وہی ملا نظام الدین ملا نظام الدین بن گئے، اور آج دنیا میں ان کی شہرت جاودانی ہوگئی، شاہ اسماعیل شہید اور شاہ عبدالحی سے بڑا عالم کون تھا؟ ان کے اندر علم و تحقیق کے خزانے پوشیدہ تھے، لیکن انھیں بھی ضرورت محسوس ہوئی تو سید احمد شہیدؒ کا دامن پکڑا جو علم و ادب میں ان کے ہم پلہ نہ تھے، اور پھر انہی کی صحبت سے وہ بن گئے۔

انسان انسان کی صحبت سے بنتا ہے

انسان انسان کی صحبت سے بنا ہے اور اسی سے بنے گا، یہی ایک آئینہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنا دیا ہے، دنیا کا ہر شخص اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، انسان کی ہم نشینی سے اخلاق رذیلہ کا ازالہ ہوتا ہے، اور ایک عزم پیدا ہوتا ہے، آپ سے نماز میں سستی ہوتی ہے لیکن آپ ایک ایسے آدمی کے ساتھ رہیں جو کڑاکے کی سردی میں تہجد کی نفلیں نہیں چھوڑتا، وہ برابر اسی سردی میں وضو کرتا ہے، نماز عشاء و فجر باجماعت ادا کرتا ہے، اس کے علاوہ نفلوں اور سنن میں بر

وقت مشغول رہتا ہے، تو آپ سے کیسے ہوگا کہ آپ دوپہر کے وقت ظہر کی نماز بھی نہ پڑھ سکیں؟ دنیا کے تمام ریاضی دانوں کا اتفاق ہے اور ریاضی کی بنیاد اسی پر ہے کہ دس پانچ سے زیادہ ہوتا ہے اور بیس دس سے زیادہ ہوتا ہے، لیکن ایسی بے شمار مثالیں ہیں جو اس سے ماوراء ہیں، ان کے پاس بیٹھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کس چیز کا نام ہے، اور اسلام کس کو کہتے ہیں، اگر آپ ان کی نمازوں پر غور کریں تو آپ کہہ اٹھیں گے کہ خدا کی قسم! اگر ہماری نماز نماز ہے، تو ان کی نماز نماز نہیں بلکہ کچھ اور ہے، اور اگر ان کی نماز نماز ہے تو خدا کی قسم ہماری نماز نماز نہیں ہوسکتی۔ ان کے یہاں دشمن کے ساتھ محبت ہے، وہ قاتل کو سینے سے لگاتے ہیں، جو ان کے پاس قتل کے ارادے سے آئے، وہ اس کو دوست بنا لیتے ہیں، جو ان کی عیب جوئی کرے، اس کو اپنا محسن سمجھتے ہیں، اور اپنی برائیوں پر غور کرتے ہیں، جو ان سے دشمنی کرتا ہے وہ اس کے لیے دعا کرتے ہیں، جو شخص ان کے پاس سے گزر جائے خواہ وہ سینے میں ان کی عداوت لیے ہو، خواہ ان کی برائی کرتا پھر رہا ہو، خواہ وہ ان کے قتل کے ارادے سے آیا ہو، وہ اس کے لیے دعا کرتے ہیں، اور اس کا گزرنا بھی فائدے سے خالی نہیں ہوتا ہے، اسے کچھ نہ کچھ حاصل ہو جاتا ہے۔

میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ چاہے کوئی کتنا ہی بڑا عالم ہو، اور کتنا ہی بڑا محقق ہو، بغیر کسی کامل یا کامل تر انسان کی صحبت کے اس کی زندگی کی ہرگز ہرگز تکمیل نہیں ہوسکتی، یہ کوئی غلط فہمی نہیں ہے، غلط فہمی زیادہ دن نہیں رہتی ہے، اسلام کے تیرہ سو برس سے یہ قانون خداوندی چلا آرہا ہے، اور اس کی مثالیں موجود ہیں، امام غزالیؒ جیسا آدمی جن کی تعلیم و تحقیق کے سامنے آج بھی یورپ کی گردنیں جھک جاتی ہیں، آج بھی یورپ ان کا لوہا مانتا ہے، ان کی کتابوں کے مختلف زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں اور عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں، لیکن ان کا حال یہ تھا کہ وہ جب اپنے شیخ کی خدمت میں جن کا کوئی نام بھی نہیں جانتا ہے، شیخ ابو علی فارمدیؒ جن کا نام آپ میں سے اکثر نہیں جانتے ہوں گے، لیکن ان کی صحبت سے امام غزالی کو کیا ملا ع

بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

عزیزو! یہاں قدم قدم پر درندے بیٹھے ہوئے ہیں، نفس پرستی، زر پرستی، جاہ پرستی اور نہ جانے کتنے کتنے فتنوں کے جال بچھے ہوئے ہیں، ہم نے دیکھا کہ کتنے لوگ علوم وفنون کے نہ معلوم کتنے دریا عبور کر چکے ہیں، لیکن نفسانیت کی ایسی پستی میں مبتلا ہیں کہ خدا کی پناہ، ان کے منہ سے ایسی ایسی پست باتیں کہی جاتی ہیں کہ سننے والا متحیر ہوجائے، اتنا بڑا علم اور ایسی پست باتیں۔ نفس پرستی اور مال و دولت کے ادنیٰ اشاروں پر وہ ملت اسلامیہ کو غارت کردینے پر تیار ہوجاتے ہیں، دین ان کے نزدیک کوئی چیز نہیں، وہ اپنے ایک ایک جملے میں ہندوستان کی ملت اسلامیہ کی ہلاکت کا سامان کردیتے ہیں۔

تم بلا استاذ و شیخ کے تعلق کے کچھ نہیں کرسکتے

میرے عزیزو! ادارے کی ذات یا کسی شخص واحد کی دعوت نہیں اور نہ کوئی اس کا مستحق ہے، جس طرح تم یہاں رہتے ہو یا دیوبند میں رہتے ہو، یہ یا کوئی بھی ادارہ ہو، جو مدرسہ ہو، جو جامع ازہر ہو یا جامع قرویین ہو، یا دنیا کی کوئی بھی درس گاہ ہو، وہاں سے صرف علم حاصل کرنا اور اس کے بعد اس سے بے تعلق ہوجانا کافی نہیں ہے، میں اس کے سوا کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ دنیا کے کسی دور میں اور دنیا کے کسی حصہ میں رہو، تم بلا استاذ و شیخ کے تعلق کے کچھ نہیں کرسکتے، اگر کچھ کرنا چاہتے ہو تو تم اپنے معلم کے سامنے سر تسلیم خم کردو، اس کے جذبات، احساسات کا مطالعہ کرو، تم اس کے روز و شب کے معمولات، اس کے حرکات وسکنات کا بغور مشاہدہ کرو، تب تمہارے اندر اتباع سنت کا عزم پیدا ہوگا۔ اگر تم چاہو کہ صرف کتابوں سے حاصل کرلو تو ایسا نہیں ہوسکتا، اگر ایسا ہوتا تو آج کیمبرج اور آکسفورڈ والے تم سے بڑھے ہوتے، ان میں نہ معلوم کتنے محدث ومفسر اور فقیہ پیدا ہو چکے ہوتے۔

عزیزو! جس طرح دنیا میں ہر چیز کا ایک نظام ہے، اسی طرح یہ بھی ایک نظام ہے، جان دو، انسان انسان سے بنتا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو صحابہ کرام آج دنیا میں سب سے افضل نہ ہوتے، یہ صحبت رسول ﷺ کی کیمیا اثری ہے، متاخرین میں بھی بہت بڑے بڑے عباد و زہاد گزرے ہیں، فرعون نے موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والے جادوگروں سے کہا کہ تم [illegible]

ہاتھ پیر کاٹ دیں گے، تو انھوں نے جواب دیا: ﴿فَاقْضِ مَا أَنْتَ قَاضٍ، إِنَّمَا تَقْضِي هَذِهِ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا﴾[1]، یہ تھی رسول کی صحبت کا نتیجہ کہ ذرا دیر میں وہ ایمان و اعتماد پیدا ہوا جس کے سامنے ہر ابتلا و مصیبت بے اثر ثابت ہوئی۔

اس بات کو یاد رکھو کہ تم اپنے کو ہمیشہ ناقص سمجھو گے، اور انسانوں کی تم تبلیغ کرتے رہوگے، خدا تم کو تمہارے اس علم سے نفع پہنچائے، جو بھائی جا رہے ہیں ہم ان کو افسوس و خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ رخصت کرتے ہیں، خدا ہماری اور ان کی طاقتوں کو برقرار رکھے اور تعلقات کو استوار رکھے۔ (۲)

---

(۱) سورہ طٰہٰ: ۷۲

(۲) دار العلوم ندوۃ العلماء سے فارغ ہونے والے طلبہ کے الوداعی جلسہ میں ۲ دسمبر ۱۹۶۳ء کو کی گئی تقریر، یہ تقریر مولانا عبد السلام قدوائی ندوی نے قلمبند کی، ماخوذ از تعمیر حیات لکھنؤ (شمارہ ۱۰ دسمبر ۱۹۶۳ء)۔

نسب وہیں جا کر ملتا ہے، میں نے ایک بار کہا تھا کہ جس مدرسہ کا نسب و نسبت صفۂ نبوی سے قائم نہ ہو وہ مدرسہ مرکز رشد و ہدایت نہیں، اور جس مسجد کی نسبت و نسب حرم مکی و حرم نبوی پر ختم نہ ہو وہ مسجد، مسجد ضرار ہے۔ الحمد للہ ہمارے مدارس کا شجرۂ نسب ختم ہوتا ہے اصل میں صفۂ نبوی پر اور اسی چراغ کی روشنی ہے جو ابھی تک ان مدارس کو منور کیے ہوئے ہے اور اسی سے اس میں قدر و قیمت بھی پیدا ہوتی ہے۔

اس وقت بلا ارادہ و بے ارادہ اور شاید بلا ارادہ زیادہ، زمانہ کے حالات و تغیرات نے علمی و دینی دنیا کی نگاہوں کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کی طرف متوجہ کر دیا ہے، اور لوگوں نے اس کا ایسا تصور اپنے ذہنوں میں قائم کیا ہے اور اس سے ایسی توقعات وابستہ کی ہیں جو اس کی حیثیت و حقیقت سے کچھ زیادہ ہیں، مجھے اس سے اکثر واسطہ پڑتا رہتا ہے، اس وقت خاص طور سے عالم عربی میں ندوۃ العلماء کا ایک بہت بلند تصور ہے، مجھے یاد ہے کہ میں ۱۹۵۶ء میں پہلی مرتبہ قبرص چلا گیا جو ایک بہت بڑا علمی و دینی مرکز بھی ہے جو بہت پہلے شام کے جزیرہ کا ٹکڑا تھا، بعض سازشوں اور سیاسی حالات کی بنا پر یونان میں شامل ہو گیا، وہاں مجھے ایک تعلیم گاہ دیکھنے کی دعوت دی گئی، میں وہاں گیا اور بہت متاثر ہوا، میں نے وہاں کے ذمہ داروں سے کہا کہ بہت شائستہ درسگاہ ہے، تو انھوں نے کہا کہ ہمارا آئیڈیل (ideal) اور ہمارے تخیل تو ندوۃ العلماء ہے، مجھے معلوم نہیں کہ وہ اس وقت میری حیثیت سے واقف بھی تھے یا نہیں۔ میں اس وقت ندوۃ العلماء کا ایسا ذمہ دار بھی نہیں تھا، میرے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب مرحوم حیات تھے، مجھے شرم بھی آئی اور خوشی بھی محسوس ہوئی، اسی طرح کوئی چند برس پہلے کی بات ہے ایک مرتبہ لندن گیا، وہاں کے عرب طلبہ نے اپنے ہاسٹل میں مدعو کیا، میرے عزیز رفیق و معاون مولوی معین اللہ صاحب بھی ساتھ تھے، طلبہ نے سوالات کرنا شروع کر دیا، اور اکثر باتیں میں پوچھتے تھے کہ اس دینی و تعلیمی نظریہ کے بارے میں ندوۃ العلماء کا کیا خیال ہے؟ وہ اس طرح پوچھتے کہ ندوۃ العلماء جیسے کوئی مستقل مکتب فکر ہے یا جیسے مذاہب فکریہ میں سے ایک مستقل مذہب ہے، میں کہتا کہ بھائی وہ بے شک ایک تعلیم

گاہ اور دانش گاہ ہے، لیکن وہ کوئی ایسا جامع مکتب خیال نہیں کہ جو ہر چیز کے بارے میں ایک مستقل نظریہ رکھتا ہو۔

روحانی تشخص و تفوق

یہ بات جہاں ہمارے لیے بڑی خوشی کی ہے وہاں بڑی ذمہ داری کی بھی ہے، اس لیے ندوۃ العلماء سے نسبت رکھنے والے نوجوانوں کو، اس سے محبت رکھنے والے اس کے فرزندوں کو اس کی شہرت عزت اور نسبت کو قائم رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے، اور اپنے کو اس کا اہل ثابت کرنا چاہیے، اس کے ساتھ ابنائے قدیم جہاں کہیں بھی ہوں انھیں وہاں کے حالات کا برابر مطالعہ کرتے رہنا چاہیے، وہاں کی دینی علمی ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے، اپنے کو مفید ہونے مفید ثابت کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اور اس کی ان خصوصیات کو جو اس کے بلند نظر و بلند نگاہ بانیوں جیسے مولانا محمد علی مونگیریؒ، حکیم عبدالحیؒ، مولانا ظہور الاسلام فتحپوریؒ، ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ، علامہ شبلی نعمانیؒ کے سامنے تھیں، جو ان کا منصوبہ تھا، جو ان کے مقاصد تھے، ان کو سامنے رکھنا چاہیے، اور فکری، ذہنی رہنمائی کے ساتھ دینی اخلاقی بلکہ روحانی تشخص و تفوق اور تفوق نہیں تو تشخص کا ضرور اظہار کرنا چاہیے کہ وہاں کے گرد و پیش کے لوگوں کو یہ محسوس ہو کہ یہاں ایسے صاحب علم عالم موجود ہیں جو صاحب فکر بھی ہیں اور جو ارجمند فکر اور دردمند دل دونوں کے جامع ہیں، ندوۃ العلماء کی بنیاد میں درحقیقت زبان ہوش مند اور ذہن ارجمند کے ساتھ دل دردمند بھی تھا، لیکن ایک دور ایسا بھی گزرا ہے کہ اکبر الٰہ آبادی نے زبان ہوش مند و ذہن ارجمند کا تو اعتراف کیا، لیکن دل دردمند کی مثالیں ان کے سامنے ایسی واضح نہیں تھیں کہ وہ اس کو بھی ندوۃ العلماء کے اوصاف میں شامل کرتے، لیکن خدا کا شکر ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی، اور محترم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کی کوششوں سے وہ بات وہ خصوصیات بھی ندوۃ العلماء میں پیدا ہو گئیں لیکن اس کو ابھی بہت بڑھانے کی ضرورت ہے، حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی دانش گاہ، تحریک اور مکتبہ فکر کا کام زبان ہوشمند اور ذہن ارجمند سے تو چل سکتا ہے لیکن اسلام کے ساتھ دل دردمند بھی

ضرور ہونا چاہیے۔

مجھے امید ہے کہ یہ میرے عزیز بھائی ان اوصاف کے (جن کو بعض جگہ متضاد سمجھ لیا گیا ہے اور حقیقت میں متضاد نہیں ہیں) جامع ہوں گے، اور عوام سے بھی تعلق رکھیں گے، ابھی تک ہماری کمزوری یہ رہی ہے کہ ہم نے زیادہ تر خواص کو مخاطب کیا، اور ہماری صلاحیتیں کچھ اس طرح کی تھیں یا ہم نے جو صلاحیتیں پیدا کیں اور جن کو ضروری سمجھا کچھ اس طرح کی تھیں کہ وہ خواص کے لیے تو مفید تھیں اور خواص کا لحاظ رکھ کر ان کی پرورش کی گئی تھی، لیکن عوام سے جو رابطہ قائم ہونا چاہیے تھا، وہ ابھی تک قائم نہیں ہو سکا تھا، مگر الحمد للہ اب عوام سے بھی ندوۃ العلماء کا رابطہ قائم ہو رہا ہے اور عوام اس سے نہ صرف متعارف ہو رہے ہیں بلکہ مانوس بھی ہوتے جا رہے ہیں، لیکن اس کوشش کو بڑھانا چاہیے، اور وہاں کے مسائل اور ماحول کو سامنے رکھنا چاہیے۔

ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں

تمام مدارس ہمارے اپنے ہی ہیں، الحمد للہ کسی کے ساتھ کوئی غیریت نہیں، یہاں جو مدارس ہیں ان کے ساتھ ان عزیزوں کو دلچسپی ہونی چاہیے، اور ان سے تعاون کرنا چاہیے، کسی قسم کی مغایرت ہرگز نہیں ہونی چاہیے، اور حقیقت میں کوئی مغایرت ہے بھی نہیں، ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں، ایک ہی نسبت کے حامل ہیں، ایک ہی مسلک پر چلنے والے ہیں، جب کبھی یہ جماعت ہدف بنتی ہے تو ہم سب ہدف بنتے ہیں، پہلے بھی کوئی حقیقی مغایرت نہیں تھی اور اب تو کسی مغایرت کی کوئی گنجائش بھی نہیں ہے۔

میں ان عزیزوں کے اس جذبہ کی قدر کرتا ہوں، خواہ اس جذبہ کے اظہار کے لیے انھوں نے کوئی بہت مناسب طریقہ نہ اختیار کیا ہو، لیکن بہر حال جذبہ قابل قدر ہے اور اصل چیز جذبہ ہے جیسا کہ میں نے کل ڈنر کے موقع پر کہا جو محترم سید حامد حسین صاحب (وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے اعزاز میں دیا گیا تھا کہ مجھے اس میں تشکر و اطمینان کی اور احسان مندی، محبت و شرافت کی جو بو نظر آتی ہے، اصل قیمت اسی تقریب کی یہی ہے، یہ

تعلق کے اظہار کا ایک طریقہ ہے، کوئی اس کا جواز ہے تو کم از کم یہ ہے کہ اس میں تعلق کا جو جذبہ کارفرما ہے وہ اعتماد و احترام کا جذبہ ہے، اور اس کے بغیر کوئی جماعت کوئی کام نہیں کر سکتی، جب تک کہ اس کو اپنے اداروں، اس کے خدمت گزاروں، اس کے کارکنوں اور اپنے استادوں کے ساتھ تعلق کو قائم رکھنے کی خواہش نہ ہو، میں ان الفاظ پر ختم کرتا ہوں، اور آخر میں ان عزیزوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں اور دنیا سے بڑھ کر آخرت میں شرمسار نہ کرے، ان کو ہم سے شرمسار نہ کرے اور ہم کو ان سے شرمسار نہ کرے، وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ يُبْعَثُونَ، يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ، إِلَّا مَنْ أَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ، وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالَى عَلَى خَيْرِ خَلْقِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ۔ [1]

---

(۱) ۲۷/فروری ۱۹۸۳ء کو بھٹکل میں ندوی برادری کے ایک جلسہ میں سپاس نامہ پیش کیے جانے کے بعد کی گئی تقریر، یہ تقریر حلیم ابو الحسن ندوی نے قلمبند کی۔ ماخوذ از "تعمیر حیات" لکھنؤ (شمارہ ۱۰/جون ۱۹۸۳ء)۔

اپنے کو نیلام کی منڈی میں نہ پیش کیجیے!

میرے رفقائے کار، اساتذۂ دار العلوم، برادرانِ عزیز، اور فرزندانِ عزیز!

مجھے سب سے پہلے اپنے اس تأثر کا اظہار کرنا ہے کہ میں نے رخصت ہونے والے بھائیوں کے اردو اور عربی مضامین سن کر خدا کا شکر ادا کیا، اور میں برملا اعلان کرتا ہوں کہ الحمد للہ جو کوششیں ہو رہی ہیں، وہ ضائع نہیں ہو رہی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ، وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَىٰ﴾ (۱)

میں اپنے عزیز رفقاء اور اساتذۂ دار العلوم کو مبارکباد دیتا ہوں کہ ان کی کوششوں اور دار العلوم کے فضلاء کی تصنیفات کا اثر ان مضامین میں ہے، میں سالہا سال سے انجمن الاصلاح کے جلسوں میں شریک ہو رہا ہوں، اور کبھی کبھی "الاصلاح" کی مجلسوں میں بھی شرکت کا اتفاق ہوا ہے، فکری و علمی لحاظ سے بھی، قوتِ تعبیر اور قوتِ بیان کے لحاظ سے بھی، اور قدرتِ تحریر اور اسلوب کے لحاظ سے بھی، اور زبان و ادب کے لحاظ سے بھی نمایاں ترقی نظر آتی ہے، یہ بات بڑی موجبِ شکر ہے، اور میں اپنے عزیز طلبہ کو ان کی ترقی اور ان کی سعادت مندی پر، ان کے تعلق و احترام پر اور ان کے خلوص و محبت پر مبارکباد دیتا ہوں، اور اپنے ان عزیز طلبہ سے معذرت کرتا ہوں جو اپنے مضامین نہیں سنا سکے، اور ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہوں، اور ان کو یہ یقین رکھنا چاہیے کہ ان کی یہ محنت ضائع نہیں ہوئی، اس لیے کہ انہوں نے مضامین تیار کرنے میں جو وقت صرف کیا ہے، وہ ان کے لیے ہر حال میں مفید ہے، اس پر زیادہ قلق نہ کریں، ان کی یہ چیز زیورِ طباعت سے آراستہ بھی ہو سکتی ہے جو ان کے لیے بطور یادگار رہے گی۔

---

(۱) سورۃ النجم: ۳۹-۴۰

اب میں مختصر وقت میں چند ضروری اور وداعی باتیں کرنا چاہتا ہوں، یوں تو وقت کا کوئی ضابطہ نہیں، لیکن چونکہ یہ الوداعی جلسہ ہے اس لیے آپ سے میں وہی باتیں کروں گا جو میرے اپنے عقیدے اور اپنے تجربے اور مطالعے کے نتائج ہیں، اور میں جن کو آپ کے لیے مفید سمجھتا ہوں، آپ کی محبت، آپ کا میرے اوپر حق کے سوا کوئی دوسرا محرک نہیں ہے۔

چار محاذ

اب میں آپ سے چار باتیں عرض کروں گا جو حالاتِ حاضرہ سے متعلق ہوں گی، اور چار باتیں آپ کی ذات سے متعلق عرض کروں گا۔

حالاتِ حاضرہ سے متعلق چار باتوں میں سے پہلی بات جو اگرچہ بہت بڑی ہے اور میری حقیقت اور حیثیت سے بلند ہے، مگر اس کے ذکر میں برکت اور حلاوت ہے، ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق (رضی اللہ عنہ) چند چیدہ اور برگزیدہ صحابہ کرام کی مخصوص جماعت میں تشریف فرما تھے، حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ میرے لیے دعا کا وقت ہے، اور ان کی طبیعت میں بھی تقاضا پیدا ہوا جو عارفین میں پیدا ہوا کرتا ہے، اور وہ تو سب عارفین سے بڑھ کر عارف تھے، انھوں نے صحابہ کرام سے فرمایا کہ آپ سب آزاد ہیں، اپنے لیے دعا کریں اور منہ مانگی مراد مانگیں، تو کسی نے کہا کہ: اے اللہ! اپنے راستے میں نکلنے کی توفیق دے کہ یہ دولت تیرے راستے میں لٹا دوں، اور تیرے بندوں کی خدمت کروں، کسی نے کہا کہ اے اللہ! اپنے راستے میں نکلنے کی توفیق دے کہ میں جہاد کر کے اپنا سر کٹاؤں اور تیرے راستے میں اپنا خون بہاؤں، اسی طرح تمام صحابہ کرامؓ کی دعائیں منقول ہیں۔ جب حضرت عمرؓ کی باری آئی تو انہوں نے فرمایا کہ میری دعا ہے کہ میرے پاس ابو عبیدہ، سعد بن ابی وقاص، جلال، خالد (رضی اللہ عنہم اجمعین) ہوں، اس کے علاوہ اور کئی نام لیے۔ بہر حال یہ سب وہ لوگ تھے جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے بڑی بڑی فتوحات مقدر کی تھیں اور بڑے بڑے کارنامے تقدیر میں لکھے تھے۔ اور کہا: ان میں سے کسی کو کسی محاذ پر اور کسی کو کسی محاذ پر بھیجوں اور ساری دنیا میں ان کے ذریعہ اسلام کا پرچم لہرا دوں، اور پوری دنیا اسلام کے زیر نگیں ہو۔

آج سے پہلے اسلام کے مستقبل کے فیصلہ کن محاذ اتنے متعین اور واضح نہیں تھے، ان پر کہر تھا، چھائی تاریکیاں تھیں کہ اس وقت متعین کر کے یہ کہنا مشکل تھا کہ یہ چار محاذ ہیں جن کے ذریعہ اسلام اور ملت اسلامیہ ہندیہ کے مستقبل کا فیصلہ ہوتا ہے، اور اپنے عقیدہ، اپنے پیغام اور اپنے تشخص کے ساتھ باقی رہ سکتی ہے یا نہیں؟ تو میرا مطالعہ ہے کہ آج سے چند سال پہلے اور خاص طور پر ۱۹۴۷ء سے پہلے یہ محاذ متعین اور واضح نہیں تھے، لیکن اس میں سیاسی تبدیلیوں، انقلاب سلطنت اور اسلام کے خلاف موجودہ مہم اور عملی تجربوں نے اس کو بالکل ایک حقیقت بنا دیا ہے، انہیں چار محاذ کا ذکر آپ سے کروں گا جن کے لیے بلند عزائم سپاہیوں، اور دینی درسگاہ کے فضلاء، اور دینی تعلیم کے تربیت یافتہ طلباء اور مخلصین کی ضرورت ہے، اور ان کے لیے اس سے بڑی سعادت نہیں ہو سکتی کہ وہ ان محاذ جنگ میں اپنی صلاحیتوں اپنی توانائیوں اور سرگرمیوں کا اظہار کریں۔

نسل نو کے ایمان وعقیدہ کی حفاظت

ان میں سب سے بڑا محاذ یہ ہے کہ ہماری ملت اسلامیہ کی آئندہ نسل مسلمان رہ جائے، اور وہ صرف ذہنی، فکری، تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے نہیں، بلکہ عقیدہ کے اعتبار سے بچ سکے۔ اس وقت سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ جو لوگ ہمارے مدارس سے فارغ ہوں، وہ اس محاذ کو سنبھالیں، اس محاذ کا چارج لیں، اور اپنے کو اس محاذ کے لیے وقف کر دیں، اور یہ کوشش کریں کہ مسلمانوں کی آئندہ نسل جو ابھی آٹھ دس برس کے بچے یا پندرہ برس کے نوجوان کی شکل میں ہیں اسلام کی اصولی، فقہی اور کلامی تعریف پر صادق ہوں، اس کے لیے ضرورت ہے اس بات کی کہ قصبے قصبے، شہر شہر اور گاؤں گاؤں مدارس و مکاتب اور مساجد کی بنیاد ڈالی جائے، اور جہاں ایسا ممکن ہو، وہاں صباحی و مسائی درجات ہوں، اور جو لوگ جدید تعلیم یافتہ ہیں اور اپنے بچوں کو سرکاری اسکولوں میں بھیجنے کے لیے مجبور ہیں، ان کو متنبہ کیا جائے، اگر ان کو ابھی سے بچانے کی کوشش نہیں کی گئی تو ڈر ہے کہ اس نئی نسل کو آگے چل کر کلامی اور فقہی اعتبار سے مسلمان کہنا صحیح ہوگا یا نہیں؟ وہ توحید و شرک اور کفر و ایمان کا فرق کر سکے گی یا نہیں!

رسالت، منصب رسالت اور رسول اللہ (ﷺ) کو نبی آخر الزماں اور آپ کی شفاعت کو مانے گی یا نہیں؟ ﴿إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ﴾ اور ﴿وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ﴾ پر اس کا ایمان ہوگا یا نہیں؟

آپ کے بلند عزائم اور بلند خیالات، آپ کے مطالعے اور پختہ صلاحیتوں پر خدا کا شکر ادا کرتے ہیں، اور اس پر آپ کو مبارک باد دیتے ہیں، لیکن اس وقت مسئلہ یہ ہے کہ کون کس محاذ کو سنبھالتا ہے، آپ ابھی سے نیت کیجیے کہ ہم اس خطرناک اور نازک محاذ کے لیے سینہ سپر رہیں گے، پھر اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے گا، اور اسباب مہیا کرے گا، اور آئندہ نسل جو ہماری اور آپ کی اولاد ہوگی، اس کو مسلمان رکھنے کے لیے جو بھی کوشش کی جا سکے کی جائے، جو ہاتھ پیر مارے جا سکیں مارے جائیں، اور جو آب دیدہ و خون جگر بہایا جا سکے بہایا جائے، یہ سب سے بڑا محاذ ہے۔

امت اسلامیہ کے ملی تشخص کی حفاظت

دوسرا محاذ یہ ہے کہ ملت اسلامیہ اپنے ملی تشخص کے ساتھ باقی رہے، یعنی اپنے عائلی قانون، قرآن مجید کے نصوص قطعیہ اور احکام قطعیہ، نکاح، طلاق کے احکام، ترکہ و تعلقات کے احکام پر عمل کر سکے، اگر وہ اس پر عمل نہ کر سکے تو بعض وقت وہ ناجائز اور حرام ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولَئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا﴾[1]

بہت سخت الفاظ ہیں، اگر خدانخواستہ یہ وقت آگیا کہ مسلمان یہاں نماز تو پڑھ سکے، کلمہ تو پڑھ سکے، قرآن شریف کی تلاوت کر سکے، لیکن وہ قرآن مجید کے عائلی احکام پر عمل نہ کر سکے، پھر اس وقت علماء کو یہ سوچنا پڑے گا کہ وہ ہجرت کا فتویٰ دیں، خدا کرے وہ وقت نہ آئے، ہم اس زمین پر اپنا حق سمجھتے ہیں، یہاں کے اہل بصیرت، عارفین، مُلہَم مِن اللہ اور

(۱) سورۃ النساء: ۹۷

اپنے عہد کے مخلص ترین بندوں نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ اس ملک سے اسلام مٹنے والا نہیں ہے، اور اس ملک کی قسمت میں اسلام لکھ دیا گیا ہے، اور اس ملک کے لیے اسلام آلاٹ ہو گیا ہے۔ اور تقدیر الٰہی کا فیصلہ ہے کہ اسلام اس ملک میں رہے، اسلام اس کی قیادت بھی کر سکتا ہے اور یہ بھی سکتا ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پھر دوبارہ اس کی قیادت مسلمانوں کے ہاتھ آ جائے، اس لیے ہم اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہیں، مگر ہمیں واقعات وحقائق کو دیکھ کر اپنی کوششوں کا رخ متعین کرنا پڑتا ہے، کیوں کہ مسلمانوں کا ملی تشخص روز بروز خطرے میں پڑتا جا رہا ہے، اس کی بے حد ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ نے شاہ بانو کیس سے گویا ایک غیبی مدد فرمائی ہے جس نے سارے مسلمانوں میں اس خطرے کے احساس کو پیدا کر دیا تھا، جس کے لیے ایک مہم چلائی گئی اور وہ ایک مرحلہ پر کامیاب ہوئی، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جمہوری اور اجتماعی طریقہ پر اتحاد اور اتفاق کے ساتھ اور خلوص کے ساتھ جو مہم چلائی جائے وہ ضرور کامیاب ہوگی، حالانکہ فیصلہ سے پہلے یہ پیشین گوئی کرنا بہت مشکل تھا کہ مسلمانوں کے حق میں فیصلہ ہوگا یا نہیں، اور ان کا مطالبہ پورا ہوگا یا نہیں؟ لیکن اللہ کے چند مخلص بندوں نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت ورہنمائی سے، قرآن مجید کی روشنی اور تاریخ کے تجربے میں صحیح طریقہ اختیار کیا تو انہیں کامیابی ہوئی۔

پیامِ انسانیت

تیسرا محاذ پیام انسانیت کا ہے، ہم اس ملک میں اس طرح رہیں کہ اپنے دین کو باقی رکھنے کے لیے بھی، اپنے دین پر عمل کرنے کے لیے، اپنے اداروں اور مرکزوں کو برقرار رکھنے کے لیے بھی، دعوت کا کام کرنے کے لیے بھی، تعلیم وتبلیغ کا کام انجام دینے کے لیے بھی، با مقصد اور با عزت زندگی گزارنے کے لیے، اپنے مخصوص عقائد کے ساتھ، اپنے پیغام ومقام کے ساتھ اس ملک میں زندگی گزار سکیں، اس کے لیے ضرورت ہے کہ فضا معتدل ہو، مشتعل اور آتش گیر نہ ہو، ورنہ کسی وقت بھی ساری کوششوں پر پانی پھر سکتا ہے، بہت کم لوگ اس کی ضرورت واہمیت کو محسوس کرتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ یہ چند آدمیوں کے ذہن کی اپج ہے، یا

بھی ہے کہ کتاب وسنت اور فقہ کا مطالعہ کریں، اور اس کے مطابق اپنی نمازوں کو بہتر بنانے کی کوشش کریں۔

بزرگانِ دین کے حالات پڑھیں!

اس کے علاوہ سب سے موثر چیز یہ ہے کہ بزرگانِ دین کے حالات پڑھیں، اور اگر اللہ تعالیٰ نصیب کرے تو کسی بزرگ کی صحبت اختیار کریں، میں تو بے تکلف کہتا ہوں کہ اس سلسلہ میں سب سے بہتر اور مفید حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) کی کتابیں، خاص طور سے ان کے ملفوظات و مواعظ ایک اچھا اثر رکھتے ہیں، میں نے الحمد للہ ساری ندویت، اپنے تمام ادبی ذوق اور تاریخی بلکہ انتقادی ذوق کے ساتھ ان سے فائدہ اٹھایا ہے، اور آپ کو بھی مشورہ دیتا ہوں کہ اس سے آپ کو اپنی جاہ طلبی، حبِ مال اور معاملات میں کوتاہی کا علم ہوگا، اور خاص طور پر اخلاق کی اصلاح، اجتماعی کاموں کی اہمیت پر ان کے یہاں بڑا زور دیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر ان سے یہ کام لیا ہے، آپ اس کی طرف ضرور توجہ دیں، آپ کے اندر اس کی کوئی مقدار ضرور ہونی چاہیے۔

زہد وایثار

دوسری چیز یہ ہے کہ اسلام کی تاریخ میں، خاص طور پر اس کی دعوت وعزیمت کی تاریخ اور اس کی اصلاحی تحریکوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ عہدِ نبوی سے لے کر آج تک علم اور نفعِ خلائق کا، اصلاح وانقلاب عمل کا اور زہد وایثار کا ساتھ رہا ہے، یہ دونوں بالکل ہم سفر ہیں، آپ اسلام کی پوری تاریخ کا جائزہ لیں گے تو معلوم ہوگا کہ ان دونوں کا کہیں ساتھ نہیں چھوٹا ہے، اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کے ذریعہ امت کو نفع پہنچایا، اور کسی بڑے فتنہ سے محفوظ فرمایا، ان میں سب سے بڑا فتنہ ردّت کا فتنہ تھا، اور دوسرا فتنہ خلقِ قرآن کا تھا، جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا ہے: ـ نَصَرَ اللّٰهُ هٰذِهِ الْأُمَّةَ ـ يا ـ حَفِظَ اللّٰهُ هٰذِهِ الْأُمَّةَ بِأَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ يَوْمَ الرِّدَّةِ وَبِأَحْمَدَ بْنِ حَنْبَلٍ يَوْمَ الْمِحْنَةِ. اور اس کے بعد جو فلسفے کے حملے تھے، جن کے مقابلہ

سے پہلے جو لوگ آئے، امام غزالی ہوں یا امام ابوالحسن اشعریؒ ہوں، پھر اس کے بعد جو فتنے تھے ان کے مقابلہ کے لیے امام ابن تیمیہؒ وغیرہ آئے، پھر ہندوستان میں صوفیائے کرام جنھوں نے مادیت، عفونت اور سلطنت کے اثر سے جو جاہ پرستی، دولت پرستی اور نفس پرستی پیدا ہو رہی تھی، اس کو روکا، پھر اس کے بعد غیر مسلموں کے اثر سے اسلامی معاشرے میں جو بدعات، مشرکانہ عقائد داخل ہو گئے تھے، اور وحدۃ الوجود کا جو اثر فلاسفہ اور صوفیوں سے ملے گراہ اور شعراء تک کے دماغوں میں سرایت کر گیا تھا، اس کے مقابلے کے لیے حضرت مجدد الف ثانیؒ آئے، پھر اس کے قرآن مجید کے براہ راست مطالعہ اور حدیث سے اشتغال نہ ہونے کی وجہ سے جو ایک جاہلیت ہندیہ اور مقامی اثرات تھے، اور اتباع سنت کا جو ذوق کم ہو گیا تھا، اور عقیدہ میں رخنہ پڑ گیا تھا، اس کے سد باب کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے اخلاف و خلفاء کو اللہ تعالیٰ نے تیار کیا۔

غرض کہ پوری تاریخ بتاتی ہے کہ اصلاح کا کام، عزیمت کا کام اور سطح سے بلند ہو کر امت کے نفع کا کام اور زہد و ایثار، دونوں میں اللہ تعالیٰ نے کوئی فطری اور طبعی رشتہ قائم کر دیا ہے جو اسلام کی پوری تاریخ میں ٹوٹنے نہیں پایا، اس لیے میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ اس کے لیے بھی آپ اپنے کو تیار کریں، کیونکہ دوسری قوموں میں بھی کوئی کام زہد و ایثار کے بغیر نہیں ہوا ہے، اگرچہ ان کے مزاج الگ، ان کے نتائج مختلف اور ان کے احکام بھی دوسرے ہیں، اس لیے اپنے آپ کو ارزاں فروشی سے بچائیں، صرف روپیہ، دنیا کو اور عہدوں کو اپنا مقصد نہ بنائیں، جہاں سے کام آ جائے، مانگا جائے، اور امید ہو جائے، لیکن آپ آنکھ بند کر کے چلے نہ جائیں اور زہد و ایثار سے کام لیں، اسی زہد و ایثار کے وعدے سے قرآن مجید بھرا ہوا ہے، اس وقت میں استیعاب نہیں کر سکتا ہوں اور نہ آپ کو ضرورت ہے۔

پوری تاریخ شاہد ہے کہ زہد و ایثار سے جو حقیقی آسودگی اور صحیح عزت حاصل ہوتی ہے وہ کہیں نہیں حاصل ہوتی ہے، اور یہی اصل مقصد ہے جو لاکھوں کروڑوں روپے کے مالک کو بھی حاصل نہیں ہے، وہ ایک لقمہ کو حلق سے اتارنے کے لیے بعض اوقات ترستے ہیں، ہمارے نوکر کہتا تھا کہ میری ساری دولت لے لو اور میرا ہاضمہ درست کر دو، اور اس قابل کر دو کہ میں کچھ

کھائیں گے، حقیقی ضرورت کی سہولتیں اور عزت کے ساتھ پیدا ہونا اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہوتا ہے۔

اگر غیر مناسب بات نہ ہوتی تو میں بتاتا کہ میں اور میرے بعض رفقا کو کن بزرگوں اور اپنے مربیوں کے فیض سے اور جو کتابوں میں پڑھا تھا، اس کے اثر سے اللہ تعالیٰ نے بچایا، تو آج ہم اس قابل ہیں، ورنہ معلوم نہیں کس یونیورسٹی یا کسی کالج میں ریڈر ہو چکے ہوتے، اور تھوڑی بہت پنشن وغیرہ جو ملتی ہے ملتی ہوتی، اور اپنے قصبہ میں بیٹھے زندگی کے دن گزار رہے ہوتے، لیکن ہمیشہ ایسے موقعوں پر بزرگوں کے واقعات سامنے ہوتے ہیں، ان میں سے مولانا عبدالرحیم صاحب کی صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں، جس کی نظیر شاید مشکل سے ملے گی۔

مولانا عبدالرحیم رامپوریؒ کا واقعہ

والد صاحب مرحوم نے "نزہۃ الخواطر" میں مولانا محمد غنی صاحب رامپوری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مولانا عبدالرحیم صاحب معقولات کے اور ریاضیات کے بہت بڑے ماہر تھے، وہ قدیم درس پڑھاتے تھے اور انھیں ریاست رامپور سے دس روپے ماہانہ ملتے تھے، ان کی اپنے فن میں قابلیت کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی، جب بریلی میں پہلی مرتبہ کالج قائم ہوا ہے تو اس کے پرنسپل مسٹر [illegible] نے ان کو آفر (پیش کش) کی کہ آپ بریلی کالج میں آجائیے اور اسّی سو روپے آپ کی تنخواہ ہوگی، تو انھوں نے بڑی سادگی سے جواب دیا کہ ریاست سے مجھے دس روپے ماہوار ملتے ہیں، وہ بند ہو جائیں گے، پرنسپل نے کہا کہ میں تو اس وظیفہ سے بیسیوں گنا زیادہ پیش کرتا ہوں، اس کے مقابلہ میں اس حقیر رقم کی کیا حیثیت ہے؟ انھوں نے عذر کیا کہ میرے گھر میں بیری کا ایک درخت ہے، اس کی بیری بہت اچھی اور مجھے مرغوب ہے، بریلی میں وہ بیری کھانے کو نہیں ملے گی، اس نے کہا کہ رامپور سے بیری کے آنے کا انتظام ہو سکتا ہے، آپ بریلی میں گھر بیٹھے اپنے درخت کی بیری کھا سکتے ہیں، مولانا نے فرمایا کہ ایک بات یہ بھی ہے کہ میرے طالب علم جو رامپور میں درس لیتے ہیں، ان کا درس بند ہو جائے گا، اور میں ان کی خدمت سے محروم ہو جاؤں گا، انگریز کی منطق نے اب بھی ہار نہیں مانی، اس نے کہا کہ میں ان کے وظائف مقرر کرتا ہوں تاکہ وہ بریلی میں

آپ سے اپنی تعلیم جاری رکھیں اور اپنی تکمیل کریں، آخر میں انھوں نے اپنی کمان کا آخری تیر چھوڑا جس کا انگریز کے پاس کوئی جواب نہ تھا، مولانا نے فرمایا کہ یہ سب صحیح ہے، لیکن آپ یہ بتائیے کہ کل قیامت میں خدا یہ سوال کرے گا کہ تم رامپور چھوڑ کر بریلی اس لیے گئے تھے کہ یہاں دس روپے ملتے تھے اور وہاں ڈھائی سو روپے ملیں گے، تو میں اس کا کیا جواب دوں گا؟ انگریز بہر حال انگریز تھا، اس نے کہا کہ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔

زہد و استغناء کی مثالیں آج پھر زندہ ہونی چاہئیں!

میرے عزیزو! میں تم سے صاف کہتا ہوں کہ ایسی مثالیں پھر زندہ ہونی چاہئیں، اللہ کا فیصلہ ہے اور اس کی سنت ہے، سارے آسمانی صحیفے بتاتے ہیں، انبیاء (علیہم السلام) کی سیرت سے معلوم ہوتا ہے، اور مصلحین کی تاریخ بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جو عزت، سکونِ قلب اور روحانی سرور عطا فرماتا ہے، اور اس کے ساتھ جو برکت ہوتی ہے، وہ سب زہد و ایثار پر موقوف ہے، اور اب پھر وہ دور آ گیا ہے، خاص طور سے ہندستان کے حالات اس زہد و ایثار کے طالب ہیں، یہ بہت بری روایت شروع ہو گئی ہے کہ جہاں زیادہ پیسے ملیں، جہاں زیادہ آسودگی حاصل ہو، اور جہاں اپنے خاندان کی آسانی سے پرورش کر سکیں، وہیں جانا چاہیے، یہ بہت بڑی آزمائش ہے، اس سے بچنے کی دعا مانگنی چاہیے۔

جمہور اہل سنت کے مسلک سے کبھی نہ ہٹے گا!

تیسری بات جو بہت تجربہ کی ہے، وہ یہ ہے کہ میں نے کبھی کتابیں پڑھیں ہیں، اسلام کے مذاہب اربعہ اور ان سے باہر نکل کر تقابلی مطالعہ کیا ہے، شاید کم ہی لوگوں نے اس طرح کا مطالعہ کیا ہو، ان تمام کے مطالعے کے نچوڑ میں ایک گر کی بات بتاتا ہوں کہ جمہور اہل سنت کے مسلک سے کبھی نہ ہٹے گا۔

اس کو لکھ لیجیے، چاہے آپ کا دماغ کچھ بھی بتائے، آپ کی ذہنیت آپ کو کہیں بھی لے جائے، کیسی ہی قوی دلیل پائیں، جمہور کے مسلک سے نہ ہٹے گا، اللہ تعالیٰ کی جو تائید اس کے

ساتھ رہی ہے، جس کے شواہد وقرائن ساری تاریخ میں موجود ہیں، چونکہ اللہ تعالیٰ کو اس دین کو باقی رکھنا تھا، اور باقی رہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی اصلی حالت پر قائم رہے، ورنہ بدھ مذہب کیا باقی ہے، عیسائیت کیا باقی ہے، عیسائیت کے بارے میں قرآن کا ”ولا الضالین“ کہنا ایک معجزہ ہی ہے، یعنی وہ پٹری سے بالکل ہٹ چکی تھی، اور اللہ تعالیٰ نے چونکہ اس دین اسلام کے بارے میں فرما دیا ہے ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ اور اس کے ساتھ جو تائید ہے، جو قوی دلائل ہیں، جو سلامت فکر اور سلامت قلب ہے، اس کے ساتھ جو بہترین انسانوں کی محنتیں اور غور وخوض کے نتائج ہیں، اور ان کا جو اہتمام ہے، اور دین موزوں ہے، وہ کسی مذہب کو حاصل نہیں ہے۔

یہ وہ بات ہے جو ہمارے اور آپ کے استاذ مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے بعض شاگردوں سے کہا، جیسے کہ مولانا اویس نگرامی صاحب نقل کرتے تھے، اور سید صاحب سے ان کے استاذ مولانا شبلی نے کہی تھی، بعض لوگ چمک دمک والی تحریر پڑھ کر دھوکا کھا جاتے ہیں ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللَّهَ عَلَىٰ مَا فِي قَلْبِهِ﴾ [1] اور صحابہ کا مذاق اڑاتے ہیں، اور کبھی علمائے سلف کا مذاق اڑاتے ہیں، کبھی مفسرین ان کے تیر کا نشانہ بنتے ہیں۔

لہٰذا مسلک جمہور سے اپنے کو وابستہ رکھیے، اس کا بڑا فائدہ ہوگا، اللہ کی توفیق شامل حال ہوگی، اس کی نصرت وبرکت ہوگی، اور حسن خاتمہ بھی ہوگا۔

یہ باتیں ہیں جن کو شاید زیادہ مؤثر طریقہ سے نہ کہہ سکا، لیکن آپ انہیں حقائق سمجھیں، اور یہ مطالعہ اور تجربہ کا حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان باتوں تک پہنچا ہوں، اور آپ تک بطور امانت اور وصیت منتقل کرتا ہوں۔

علم سے ہمیشہ اشتغال رکھیں!

دوسری آخری بات یہ ہے کہ علم سے اپنا اشتغال رکھیے، اپنے کو کبھی فارغ التحصیل نہ سمجھئے،

(۱) سورۃ البقرۃ - ۲۰۴

ہمیشہ نئی اور پرانی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہیے، خواہ آپ کہیں رہیں، قرآن مجید کی تفسیریں، حدیث شریف کی شرحیں، تاریخ کی کتابیں، اور جو کتابیں علم کلام پر، اور صحیح عقائد کو پیش کرنے کے لیے صحیح طریقہ پر لکھی گئی ہیں، ان سب سے آپ کا ربط رہے، اور ان کا ہمیشہ مطالعہ کرتے رہیں، اور اپنے مرکز سے برابر تعلق قائم رکھیں۔

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ[1]

(۱) دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) سے فارغ ہونے والے طلبہ کے الوداعی جلسہ میں بتاریخ ۲۲/فروری ۱۹۸۹ء بروز چہار شنبہ بعد نماز مغرب بمقام جمالیہ ہال میں کی گئی تقریر، ماخوذ از "تعمیر حیات" لکھنؤ (شمارہ ۲۵/مارچ ۱۹۸۹ء)۔

کی گئی ہے، تاریخ ادب کے مطالعہ میں اور دنیا کی ادبیات کے تقابلی مطالعہ میں، وہ حضرت خنساء کی ذات ہے، حضرت خنساء کا یہ امتیاز ہے کہ انھوں نے اپنے بھائیوں کی وفات پر ایسے دل دوز، جگر خراش مرثیے کہے، کہ جن کا میں اپنی محدود واقفیت کی بنا پر جو صرف تین چار زبانوں سے ہے، اور ان میں بھی مراتب ہیں، یہ کہہ سکتا ہوں کہ دنیا کے لٹریچر میں اس کی مثال نہیں مل سکتی، کہ فرزندوں کے مرثیے، اور دل بندوں کے مرثیے، جگر گوشوں کے مرثیے، بادشاہوں کے مرثیے تو بہت ہیں، لیکن بھائیوں کے، ایک ایک بھائی پر اس طرح رونا اور عمر بھر روتے رہنا، یہاں تک کہ یہ ان کا امتیاز بن گیا ہے کہ وہ مراثی کی بہت بڑی شاعرہ ہیں، جنھوں نے اپنی پوری قوت شاعری، صنف شاعری صرف کردی ہے اپنے بھائیوں کے مرثیہ میں، اس کی مثال نہیں مل سکتی۔

اور آپ سب (اللہ تعالیٰ آپ کے عزیز و اقارب سب کو زندہ سلامت رکھے، اور آپ ان کے لیے قابل تسلی اور وہ آپ کے لیے قابل فخر ہوں) آپ بھائیوں اور فرزندوں کا فرق خوب سمجھتے ہیں، اس عمر میں بھی سمجھتے ہیں جو عمر اس کی زیادہ سمجھنے کی نہیں ہے، لیکن پھر بھی آپ اپنی فطرت سلیم سے سمجھتے ہیں، کہ بھائی کیسا ہی عزیز ہو، اور کیسا ہی وہ قابل فخر ہو، اور کیسا ہی وہ سرمایۂ حیات ہو، اور کیسا ہی بڑا محسن ہو، لیکن اس میں اور فرزند میں فرق ہوتا ہے۔

حضرت خنساء کا یہ امتیاز ہے کہ ساری عمر ان کی اپنے بھائیوں کا مرثیہ کہنے میں گزری، لیکن اس کا آپ مقابلہ کیجیے، اور میں اپنے ادبی مطالعہ کی روشنی میں کہتا ہوں کہ ایسے مرثیے شاید کسی بھی زبان میں نہیں ملیں گے، جیسے کہ عربی زبان میں یہ مرثیے ہیں، اور وہ تاریخ ادب کا ایک اہم جزو اور عنصر ہے، لیکن یہ بات دیکھنے کی ہے کہ جب بیٹوں کا معاملہ آیا فرزندوں کا معاملہ آیا، جو ان کے جسم کے ٹکڑے تھے، آخری بات جو کہی جا سکتی ہے، وہ یہ کہ ان کے جسم کے ٹکڑے تھے، کہ ایک غزوہ کے موقع پر انھوں نے اپنے بیٹوں کو بلایا اور ایک ایک بیٹے کو رخصت کیا کہ جاؤ، اللہ کے راستے میں جہاد کرو، اور خبر آئی کہ وہ شہید ہوگئے، دوسرے بیٹے کو رخصت کیا، اور خبر آئی کہ وہ شہید ہوگئے، اور پھر تیسرے بیٹے کو، اور اس توقع نہیں بلکہ اس یقین کے ساتھ بھیجتی تھیں کہ وہ زندہ نہیں آئے گا، اور کہتی تھیں کہ بیٹا کوئی کوتاہی نہ کرنا، اللہ کی راہ

میں جان دینا، اللہ تعالیٰ نے ان کو کئی فرزند عطا فرمائے تھے، جب سب بیٹوں کی شہادت کی
خبر ملی تو یہ تاریخ ادب میں انھیں کے لفظوں میں اس بات کو محفوظ کر دیا گیا ہے کہ انھوں نے
کہا: "الحمد للہ الذی اکرمنی بشہادتہم" "اس خدا کا شکر ہے جس نے مجھے عزت
بخشی ان کی شہادت سے"۔

مادرِ علمی کی مثال

تو ایک مثال تو میں ذہنی اور علمی اور فطری ماں کی دیتا ہوں، اور اسی کے ساتھ آپ
مادر علمی یعنی مدارس دینیہ اور مربیان، سرپرستان علمی اور سرپرستان روحانی کے واقعات تاریخ
میں دیکھیں گے، اور ہماری پوری تاریخ دعوت اس سے بھری ہوئی ہے، شروع سے لے کر
آپ دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ماں کی شفقت رکھنے والے، بلکہ بعض وقت ماں کی
شفقت سے زیادہ شفقت رکھنے والے بزرگوں نے اپنے فرزندوں کو جدا کیا اور اس وصیت
کے ساتھ جدا کیا کہ جو حدیث کے الفاظ ہیں: "اَسْتَوْدِعُ اللّٰہَ دِیْنَکَ وَ اَمَانَتَکَ وَ خَوَاتِیْمَ
عَمَلِکَ" اس کو یہ وصیت کی کہ علم پھیلاؤ، دین کی حفاظت کرو، اور دین کے تقاضے جو ایک
داعی کے لیے، اور دین کے ایک عالم و حامل کے لیے، اور ایک غیور مسلمان کے لیے اور ایک
ایمان کی قدر و قیمت، اپنے ایمان کی بھی اور امت اسلامیہ کے ایمان کی بھی قدر و قیمت
جاننے والے کا جو فریضہ ہے وہ ادا کرو، اس کی اتنی مثالیں ہیں کہ میں سب مثالیں نہیں دے
سکتا۔ میں صرف دو مثالیں دوں گا، ہندوستان میں جن کو اس وقت کے حالات سے بہت
زیادہ مطابقت ہے، اور ہمیں ان کی مثالیں دے کر بتانا ہے کہ آج اس سعادت مندی کا،
اس وفاداری کا، اور اس ایمان پروری کا، دین پروری کا، اور حمیت اسلامی کا تقاضا کیا ہے؟

حضرت مجدد الف ثانیؒ اور فتنۂ اکبری کا مقابلہ

ایک حضرت مجدد الف ثانی (رحمۃ اللہ علیہ) کی مثال دوں گا۔ اس جلسہ میں بھی برکت
پیدا کرنے کے لیے اور قبولیت پیدا کرنے کے لیے، اور ان کا حق سمجھ کر، کہ حضرت مجدد الف

ثانی (رحمۃ اللہ علیہ) کی ایک اکیلی ذات تھی، پورا اکبری دربار تھا اور اس کے وسائل تھے، اس کے وزراء تھے، اس کے لشکر تھے اور لشکر صرف فوجوں کے نہیں، سپاہیوں کے نہیں، بلکہ ذہین انسانوں کے لشکر تھے، اور میں اپنے تاریخی مطالعہ کی بنا پر کہتا ہوں کہ اس وقت ہندوستان ہی نہیں بلکہ اس عہد کے بعض ذہین ترین انسان اس کو میسر آگئے تھے، ملا مبارک اور اس کے دونوں بیٹے ابوالفضل اور فیضی، اور پھر اس کے بعد ایران سے کئی ذہین لوگ، جو قریش جیسی قسم کے لوگ آگئے تھے، جنہوں نے اکبر کی اس امیت اور اکبر کی اس عزیمت سے پورا فائدہ اٹھایا۔

تاریخ کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ جب امیت اور عزیمت دونوں جمع ہوجائیں، تو یہ بڑی خطرناک بات ہوتی ہے، اس لیے کہ علم ہے جو جگہ جگہ دامن پکڑتا ہے اور روکتا ہے، اور یا پھر ضعف ارادہ ہے، ارادہ کی اور عمل کی کمزوری ہے جو حائل ہوجاتی ہے اور سد راہ ہوتی ہے، لیکن جہاں امیت، جہاں امّی اور عزیمت دونوں جمع ہوجائیں اور پھر اس کے ساتھ اس کو ایسے لوگ مل جائیں جو اس کو فکری غذا بھی پہنچاتے ہوں، اور جو تزئین بھی کیا کرتے ہوں، اس کے جو نتائج ہیں، وہ تصور سے بالاتر ہوتے ہیں، اور یہ نازک ترین گھڑی ہوتی ہے۔

ایک طرف اکبر اپنی ان طاقتوں کے ساتھ تھا، کہ اس کو اس وقت کے جو سرمایۂ امتیاز اور قابل فخر علوم سمجھے جاتے تھے، ان کے ماہرین یعنی فلسفہ و منطق کے ماہرین اور ادب اور شاعری کے ماہرین کی ایک جماعت مل گئی تھی، اور پھر یہاں کا جو برہمن عنصر تھا، اور یہاں کا ذہین عنصر تھا، وہ بھی اس کے ساتھ تھا، بیربل اور دوسرے جو اس کے ارکان تھے، یہ سب ایک طرف تھا، اور ایک اللہ کا بندہ جس کا نام محمد بن عبدالاحد سرہندی ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کی بارش ہو ان پر، ان کی تربت مبارک پر، ان کی روح مبارک پر، وہ تھے، انھوں نے اپنے فرزندوں کو، اور اپنے خلفاء کو تیار کیا اس فتنے کے مقابلے کے لیے۔

فتنہ کیا تھا؟ یہ وہ فتنہ تھا جس کو ہم اس وقت دوسرے زمانوں کے مقابلے میں بہت آسان سمجھ لیا ہے، اور یہ بات کوئی خوشی کی نہیں ہے، مسرت کی نہیں ہے، بڑے ہی غم اور فکر کی

بات ہے کہ دورِ اکبری کا تذکرہ کریں اور زمانے کی، تو آسان نہیں تھا جتنا اس زمانے میں، مگر جب اقتدار اور انتخاب کے ذریعے سے ملک کی سیاست وطاقت ان جماعتوں کے ہاتھ میں آ رہی ہے، اور ان افراد کے ہاتھ میں آ رہی ہے جو دورِ اکبری کا خواب دیکھ رہے ہیں، اور جن کے لیے دورِ اکبری کا خواب پورا کرنے کے زیادہ امکانات وذرائع کل کو حاصل ہیں، مذہب کے رشتے سے بھی، اور ملک کے رشتے سے بھی، اور قدیم تاریخ کے حوالے سے بھی۔

وہ حضرت مجدد سرہندی ایک طرف ہیں، اور پورا اکبر کا دربار ایک طرف، اور ان میں بڑے مسلمان امراء بھی، عبدالرحیم خان خاناں، اور سید فرید اور یہ حضرات بھی ہیں، جو بڑے گھرانوں کے چشم وچراغ ہیں اور شریف ترین اور ذہین ترین انسان ہیں، اس وقت کوئی تقابل نہیں تھا۔

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی نے جو ہمارے ندوۃ العلماء کے بانیوں اور سرپرستوں میں ہیں، انھوں نے حیدرآباد کی تقریر میں ایک بات کہی اور بڑا اچھا بتایا، اور پھر اس کی شرح مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی نے اپنے اس مضمون میں کی جو حضرت مجدد صاحب پر لکھا ہے اور "الفرقان" میں چھپا ہے، کہ لوگ تاریخ پڑھتے ہیں اور پڑھتے ہیں کہ اکبر کے بعد جہانگیر آیا، اور جہانگیر اکبر سے بہتر تھا، آپ کو معلوم ہے کہ ایک زنجیر عدل اس نے لٹکائی تھی، اور جب اس نے کانگڑہ کا قلعہ فتح کیا تو وہاں سب سے پہلے کام جو کیا ہے وہ یہ کہ مسجد بنانے کا حکم دیا، اور گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ یہ بعد میں معلوم ہوگا کہ یہ بات کہاں سے آئی؟ تو اکبر کے بعد جہانگیر آتا ہے جو اس سے کہیں بہتر ہے، اور جہانگیر کے بعد شاہجہاں آتا ہے جو تخت طاؤس پر بیٹھنے پر جب جاتا ہے اور سجدہ کرتا ہے، اور دو رکعت نماز پڑھ کے کہتا ہے کہ فرعون بڑا متکبر تھا، بہت اونچا آدمی تھا کہ آدمیوں کے تخت پر بیٹھ کر اس نے خدائی کا دعویٰ کیا، لیکن میں امت محمدیہ کا فرد ہوں، میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔ تو جہانگیر کے بعد شاہجہاں آتا ہے جو اس سے کہیں بہتر ہے، اور شاہجہاں کے بعد محی الدین اورنگ زیب آتا ہے جو صحیح معنی میں محی الدین اورنگ زیب ہے، وہ سب تاریخ پڑھتے ہیں۔

تو نواب صدر یار جنگ مرحوم نے فرمایا کہ لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ عام قاعدہ یہ ہے کہ بد سے بدتر آتا ہے، اس لیے کہ وہ بدجو ہیں، اس کے اثرات ہوتے ہیں، اور پھر وہ جس حیثیت کا آدمی ہے، اور جو وسائل رکھتا ہے، اس کے مطابق اس کے اثرات پڑتے ہیں، تو اکبر اور اکبر کے اثرات کو، بلکہ اکبر کی جہانگیری کو، اس کی فتوحات کو، اور اس کی شہر کشائی کو، اور لشکر کشی کو دیکھیے کہ اس وقت سلطنت عثمانیہ کے خلیفہ کے بعد سب سے طاقتور سلطنت اس وقت اکبر کی سلطنت تھی، پورے ایشیا میں نہیں، بلکہ پورے عالم اسلام میں، اور سمجھئے کہ ایک حیثیت سے متمدن دنیا میں، تو اکبر کے بعد اس سے بدتر آدمی آنا چاہیے تھا، اس لیے کہ عام طور پر زمانہ انحطاط کی طرف چلتا ہے، اور برے اثرات کو قبول کرتا ہے، اور نشیب کی طرف جانا آسان ہوتا ہے، اور بلندی کی طرف جانا مشکل ہوتا ہے، کیا بات ہے کہ اکبر کے بعد جہانگیر آتا ہے جو اس سے بہتر، اور جہانگیر کے بعد شاہجہاں آتا ہے جو اس سے بہتر، اور شاہجہاں کے بعد محی الدین اورنگ زیب آتا ہے جو اس سے کہیں بہتر، جس کو علی الطنطاوی کہتے ہیں کہ وہ سادس الخلفاء الراشدین ہیں، ان کو چھٹا خلیفۂ راشد ماننا چاہیے، اور پورا مضمون ہے بقیۃ الخلفاء الراشدین کے عنوان سے، جس میں انھوں نے دکھایا ہے کہ وہ خلفاء راشدین کا ایک نمونہ تھے، اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کے بعد ایسی مثال ملنی مشکل ہے۔

تو نواب صدر یار جنگ نے کہا کہ لوگ اس پر غور نہیں کرتے کہ کیا یہ فطرت انسانی کے، تجربۂ انسانی کے، تاریخ انسانی کے، نفسیات انسانی کے خلاف ہو رہا ہے، کہ ایک غلط آدمی ہے، اور وہ پورے اپنے غلط ہونے کا سایہ پھیلاتا ہے، اور وہ بالکل ڈھالنا چاہتا ہے اس سانچہ میں، لیکن اس کے برخلاف ہوتا ہے کہ اس سے بہتر آدمی آتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ حضرت مجدد الف ثانی (رحمۃ اللہ علیہ) کا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اندر اندر ایسا انقلاب کیا کہ جو بعد میں آتا ہے وہ بہتر ہوتا ہے، چنانچہ سب کو معلوم ہے محی الدین اورنگ زیب ان میں سب سے بہتر تھا، اور اس کے حالات بالکل اولیاء اللہ کے سے ہیں، یعنی اس کے حالات کیا بیان کیے جائیں! انتقال کے وقت اس نے وصیت کی کہ یہ ڈیڑھ روپے دو روپے جو ہیں یہ میرے کفن میں صرف کیے جائیں، اس سے زیادہ

میرے کفن میں صرف نہ کیا جائے، اس لئے کہ ٹوپی سی کر میں نے اس کی قیمت جمع کی ہے، اور باقی میرا جو ترکہ ہے ستر سوا ستر ہزار کا، وہ میں نے قرآن شریف لکھ کر اس کو حاصل کیا تھا، وہ غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے، پھر روزے کی جو شان لکھی ہے سوانح نگاروں نے، اور میں اپنے والد صاحب کی کتاب کا حوالہ نہیں دوں گا کہ بہرحال وہ عالم دین تھے، اور ان کے جذبات اور خاندانی اثرات تھے، لیکن شیخ ذکاء اللہ صاحب اور پھر فاروقی صاحب کی کتاب جو انگریزی میں ہے، بہرحال کے ایک وکیل تھے، سب سے بہتر کتاب ہے انگریزی میں، اور اس کے علاوہ ہمارے بشمبر ناتھ پانڈے صاحب، جو کل تک یہاں موجود تھے اور کل کے جلسے میں تھے، انھوں نے اپنی کتاب میں اورنگ زیب کا جو کیرکٹر لکھا ہے، اس سب سے معلوم ہوتا ہے، یہ کیا بات ہے؟ یہ بالکل خرق عادت تھی یہ یا اس کو اتفاق پر محمول کیا جائے؟ یہ حضرت مجدد صاحب کا اثر ہے کہ وہ اور ان کے تربیت یافتہ خلفا، اور سب سے بڑھ کر ان کے صاحب زادے حضرت خواجہ محمد معصوم، ان کی روحانیت، ان کا درد دل، ان کا سوز جگر، اور ان کی فکر اور دین سے ان کا عشق کام کر رہا تھا، یہ جواب ہوتا تھا، جو پہلے سے بہتر ہوتا تھا، یہ حضرت مجدد صاحب کا میں ایک حوالہ دیتا ہوں۔

جہاں تک اورنگ زیب کا تعلق ہے، تو خیر وہ حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندی سے بیعت تھے، انھوں نے خواجہ محمد معصوم کو بلانا چاہا، تو وہ تو کہاں آتے، انھوں نے اپنے صاحب زادے خواجہ سیف الدین کو بھیج دیا، وہ قصر سلطنت میں رہے، وہاں پہلے جاتے ہی وہاں کے ان منکرات کو دور کیا جو پہلے سے چلے آرہے تھے، اور پھر اپنے والد صاحب کو لکھا کہ بادشاہ میں آثار ظاہر ہو چکے ہیں، اور خود حضرت خواجہ محمد معصوم کے مکاتیب دیکھیے جو بادشاہ کو لکھے ہیں، تو اس میں وہ ان کو شہزادہ دین پناہ لکھتے ہیں، جب وہ شہزادہ تھے، یہ ان کی فراست ایمانی اور ان کی روحانیت ہے کہ اس وقت جب اس کا کوئی امکان نہیں تھا، وہ لکھتے ہیں شہزادۂ دین پناہ، وہ شہزادہ دین پناہ سلطان دین پناہ بن گیا، تو نواب صدر یار جنگ مرحوم نے فرمایا کہ لوگ نہیں دیکھتے کہ یہ کیوں ہوا تھا، یہ انحطاط کے زمانے ترقی کیوں ہو رہی تھی، بہتری کی طرف کیوں جا رہا تھا یہ خاندان مغلیہ؟ یہ اثر تھا حضرت مجدد الف ثانی کا۔

ایک ماں وہ تھی جس نے ایسے فرزند پیدا کیے، اور انھوں نے یہ کرامت دکھائی، اور یہ میں ایک اعجاز نہیں کہتا، معجزہ نہیں کہتا، لیکن یہ بالکل ایک خارق عادت چیز دکھائی، کہ تاریخ انسانی کے دفتر میں ایک نیا تجربہ ہوا۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور خدمت حدیث

اس کے بعد میں دوسرا نام لوں گا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی (رحمۃ اللہ علیہ) کا، اور آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ حقیقت میں یہ دار العلوم ندوۃ العلماء، اور دوسرے مدارس، جن میں دار العلوم دیوبند، مظاہر علوم، اور اس کے ہم مسلک جتنی درسگاہیں ہیں، وہ سب حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (رحمۃ اللہ علیہ) کے مدرسۂ فکر پر قائم ہوئے ہیں، جن لیں فضلاء جو جا رہے ہیں کہ آپ اسی خاندان کے نونہال ہیں، آپ اسی شجرۂ طوبیٰ کی شاخیں ہیں، اور پتے ہیں، آپ کو کبھی اس شجرۂ طوبیٰ سے اپنا رشتہ نہیں توڑنا چاہیے، آپ کی سب سے بڑی کامیابی اور سعادت مندی اور آپ کی سعادت فرزندی یہ ہے کہ آپ اس شجرۂ طوبیٰ سے تعلق رکھتے ہیں، جس کی شاخ ہم سمجھتے ہیں کہ کم سے کم ہندوستان میں ہر صحیح العقیدہ، توحید خالص اور سنت صحیحہ کی پیروی کرنے والے کے گھر میں ضرور ہوگی۔

اس مادر علمی نے کیا کیا؟ مجھے معاف کیا جائے، میں یہ لفظ بولتا ہوں کہ اس سے زیادہ شفقت کا لفظ اور فطری تربیت کا لفظ اور جس کے لیے عربی میں بھی اُمومت سے بڑھ کر، حنان اُم سے بڑھ کر کوئی لفظ نہیں ہے، اس ولی اللہی درسگاہ اور مادر علمی نے کیا کیا، کہ حدیث تقریباً ہندوستان سے ناپید ہو چکی تھی، شیخ عبد الحق محدث دہلوی باہر سے حدیث لے کر آئے، لیکن وہ ان کے فرزندوں کے دائرہ میں محدود تھی، اور آپ اگر پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی کی کتاب جو ان پر ہے، اس کو پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ ان کے اثرات کیا پڑے، ان کے اثرات پڑے، اور وہ بہت ہی قابل اعتراف اور قابل شکر ہیں، اور وہ مستحق دعا ہیں۔

لیکن سچی بات یہ ہے کہ حدیث کے درس کی عمومیت، حدیث کی تحقیق، حدیث کی

خدمت۔ اور صحاح ستہ کا درس، اور اس سے بڑھ کر سنت سنیہ کی اشاعت اور اس کی رغبت پیدا کرنا اور بدعات کے خلاف جہاد، اور بدعت کے خلاف محاذ آرائی، ایک پورا محاذ قائم کرنا، علمی محاذ، فکری محاذ، اعتقادی محاذ، عملی محاذ قائم کرنا، یہ فیض ہے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کی درسگاہ کا۔

انھوں نے دہلی کے ایک محلہ میں، ہم نے اس محلہ کی زیارت کی ہے، اور اگر آپ والد ماجد مرحوم (رحمۃ اللہ علیہ) کا سفرنامہ "دہلی اور اس کے اطراف" پڑھیں، جو حضرت سید سلیمان ندوی (رحمۃ اللہ علیہ) نے اپنے حواشی کے ساتھ 'معارف' میں سب سے پہلے شائع کیا، اور پھر اس کے بعد وہ انجمن ترقی اردو (دہلی) کی طرف سے شائع ہوا، اور اس کے کئی ایڈیشن نکلے ہیں، تو (اب تو مکان بھی معلوم نہیں اس کے نشان ہیں یا نہیں) دہلی کے غریبوں کے ایک محلہ میں، ایک بالکل دنیا کے سامان آرائش سے خالی، (محروم تو نہیں کہنا) ایک گوشہ میں ایک مکان تھا، وہاں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے حدیث کا درس دینا شروع کیا، اور وہیں حجۃ اللہ البالغۃ اور یہ کتابیں لکھی گئیں، یا کچھ سفر میں، اور وہاں صحاح ستہ کا درس دیا، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے درس دیا، اس درس سے کیسے لوگ پیدا ہوئے؟ شاہ اسحاق صاحب محدث اور حضرت شاہ محمد یعقوب محدث، شاہ عبدالغنی محدث، جن کے تلمذ کا سلسلہ دیوبند تک پہنچتا ہے، اور حضرت مولانا علامہ حیدر علی رامپوری مقیم ٹونک اور ایسے بڑے محدث اور عالم پیدا ہوئے۔ پھر اس کے بعد ان لوگوں نے وہاں حرمین شریفین میں جا کر، حجاز میں جا کر حدیث کا درس دیا، اور حدیث عام ہوئی۔

تو میں نے یہ مثالیں نادر علمی، نادر روحانی، نادر ترقی کی دیں، ان کے کارنامے کو میں نے بیان کیا، ایسی کئی اور نادر علمی کی مثالیں دی جا سکتی ہیں، اور ایک خنساء کا واقعہ بیان کیا جنھوں نے اپنے ہاتھ سے اپنے بیٹوں کو میدان جنگ کے لیے رخصت کیا، یہ جانتے ہوئے کہ یہ شہادت زار ہے، یہاں آدمی اسی لیے جاتا ہے کہ اللہ کے راستے میں سر کٹائے، اور ان کی شہادت پر اللہ کا شکر ادا کیا۔

آج کا فتنہ کیا ہے؟!

اب میں آپ سے یہ کہتا ہوں کہ آپ کے لیے سعادت مندی کی بات، اور آپ کے لیے انتہائی شرافت کی بات، اور شکر گزاری کی بات، اور بلکہ خوش قسمتی اور بلند طالعی کی بات یہ ہے کہ آپ اس وقت یہاں سے نکلنے کے بعد اس وقت کے فتنے کو آپ سمجھیں، آج کیا ہے؟ میں آپ سے صاف صاف کہتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے استیصال (اور جس کو عربی میں حسرتہ الإبادۃ کہتے ہیں)، یعنی ان کی معنوی، اعتقادی، تہذیبی، ثقافتی نسل کشی کا پورا نقشہ تیار ہے، پورا منصوبہ تیار ہے، اور چونکہ مجھے دینی تعلیمی کونسل کی خدمت کا شرف حاصل ہے، اور شروع سے اس سے تعلق ہے، اور اس کے ذریعے سے بہت سی ایسی چیزوں پر نظر پڑ جاتی ہے جن پر عام لوگوں کی نظر نہیں پڑتی، کہ اس وقت بی جے پی کے پاس بھی، اور جو بنیاد پرست فرقہ پرست لیڈر رہیں اور جن کو اپنی قوم میں مقبولیت حاصل ہے، اور وسائل حاصل ہیں، امکانات بھی ان کے لیے آسان ہیں، ان کے پاس پورا نقشہ بنا ہوا ہے کہ بہت سی دل پہ پتھر رکھ کر اور بڑی اذیت کے احساس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے، کہ اس ملک کو (اس سے زیادہ اور میں نہیں کہہ سکتا)، اس ملک کو اسپین بنا دینا چاہتے ہیں، یہ نقشہ بالکل تیار ہے، اس میں کسی قسم کا تردد اور ابہام نہیں ہے، فیصلہ شدہ بات ہے، اور اس کے لیے سب یہ آپ دیکھ رہے ہیں، یہ بابری مسجد کی شہادت، اور ان کے اس وقت جو جذبات ہیں، اگر آپ ہندی کے اخبارات پڑھتے ہوں یا کم سے کم انگریزی ہی کے اخبارات پڑھتے ہوں، یا ان کے کسی جلسہ کی روداد آپ کو معلوم ہو، اور ان کی تقریروں کے اگر آپ خلاصے سن لیں، یا وہاں آپ شریک ہو سکیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس پر پورا اتفاق رائے ہو گیا ہے، پورا اجماع جیسے ہوتا ہے، کہ اس ملک میں اب یہ ایک نیا دور شروع ہوگا، اور اب یہاں مسلمانوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں، ان کو باہر چلا جانا چاہیے، اور اگر یہ رہیں تو اپنے ہر قسم کے ملی تشخص سے محروم نہیں، بلکہ بے زار ہو کر رہیں، ہر قسم کا تشخص جو ان کو ممتاز کرتا ہے غیر مسلموں سے، ان لوگوں سے جو مسلمان نہیں، ان سب سے خود دستبردار ہوں اور بے زار ہوں، اس کی تفصیلات میں میں جانا نہیں

چاہتا اور اس کی طبیعت متحمل بھی نہیں ہے، لیکن اس کی تفصیلات آتی رہتی ہیں، اور اندیشہ ہے کہ اور زیادہ آئیں۔

آج پورا ایک دور اکبری شروع ہو رہا ہے

تو اس وقت یہ ایک پورا دور اکبری شروع ہو رہا ہے، لیکن دور اکبری سے زیادہ اس کے پاس اسلحہ اور سہولتیں اور مقبولیت کے ذرائع ہیں، اور یہاں کی تاریخ اور یہاں کی سرزمین اور یہاں کے جو تاثرات اور جذبات ہیں، ان سے زیادہ ہم آہنگی پائی جاتی ہے، کہ اکبر نے تو ایک ایسی چیز شروع کی تھی جس کے لیے ملک پورے طور پر تیار نہیں تھا، لیکن اب صحافت کے ذریعے، ایڈمنسٹریشن کے ذریعے لٹریچر کے ذریعے، اور سب سے بڑھ کر جمہوریت کی انتخابات و الیکشن کے ذریعے ملک کو تیار کر دیا گیا ہے کہ یہاں کی اکثریت اس پر تلی ہوئی ہے کہ اس ملک سے اسلام کا اخراج کر دے، یا کم سے کم مسلمان اس ملک کو چھوڑ کر جانے پر مجبور ہو جائیں، جن میں ذرا بھی دینی حمیت ہے۔

اب میں آپ سے صاف صاف کہتا ہوں، اور اپنے اوپر حق سمجھتا ہوں کہ آپ سے یہ کہوں کہ اس وقت آپ کے لیے، بغیر کسی معذرت کے کہتا ہوں، اور اپنے عقیدے اور اپنے تجربے اور الحمدللہ اپنے اور اپنے متعدد ساتھیوں کے عمل و کردار کے اعتماد پر بھی کہتا ہوں کہ یہ بات جو میں کہہ رہا ہوں، ایسی بات نہیں جو صرف خیال ہے، اور جو صرف آپ سے کہی جا رہی ہے، اور اس پر عمل نہیں ہو رہا ہے کہ آپ کی کامیابی اس میں نہیں ہے، آپ کے حق فرزندی ادا کرنے کا یہ مظہر نہیں ہے کہ آپ یونیورسٹیوں میں جائیں، اور وہاں سے گریجویشن کریں، صاف صاف کہتا ہوں، میں انگریزی زبان کا مخالف نہیں، الحمدللہ انگریزی زبان سے واقف ہوں، انگریزی زبان سے بہت فائدہ اٹھایا ہے، اور اپنی مجلسوں میں کہتا رہتا ہوں کہ تھوڑی سی انگریزی جاننی چاہیے، تاکہ آپ اسلامیات پر ایسا تقابلی مطالعہ پیش کر سکیں اور ان کتابوں کے حوالے دے سکیں، اور یہاں انگریزی نصاب درس میں داخل ہے، لیکن آپ اس کو مقصد بنائیں، آپ اس کو اپنی کامیابی کا معیار سمجھیں کہ آپ یونیورسٹیوں میں جائیں، اور بی۔

اے، ایم اے کریں، اور اس کے بعد آپ کو کہیں لکچرر شپ مل جائے، کہیں اور آپ کو کوئی جگہ مل جائے، یہ آپ کی سعادت مندی اور حق فرزندی نہیں۔

یہ بھی صفائی سے کہتا ہوں کہ آپ کی سعادت مندی اور حق فرزندی یہ نہیں ہے کہ آپ خلیج عرب میں جائیں اور آپ وہاں نوکریاں تلاش کریں، جو آپ کو آسانی کے ساتھ مل سکتی ہیں اور آپ کے بہت سے بھائی، یہاں کے فضلاء وہاں ہیں، لیکن میں صاف صاف کہتا ہوں کہ ان میں سے کسی ایک چیز کے ذریعے بھی آپ یہاں کا حق نہیں ادا کرسکیں گے جس حق کا اظہار آپ نے بڑی بلاغت کے ساتھ، اور بڑی ادبیت کے ساتھ، اور بڑے اعادہ اور تکرار کے ساتھ اپنے قابل قدر مضامین میں کیا ہے، اور میں سنتا رہا ہوں کہ آپ نے اس دارالعلوم سے، اس کے اساتذہ سے، اپنے کس شریفانہ تعلق کا، اپنے فرزندانہ تعلق کا اور رابطہ کا اظہار کیا ہے، اس کا حق اس سے نہیں ادا ہوگا۔

اگر یہی کرنا تھا میرے عزیزو، پھر انگریزی پڑھتے اور آپ انگلینڈ اور امریکہ جاتے، اور وہاں بھی نوکریاں مل رہی ہیں اور ہمارے لاکھوں لاکھ پاکستانی ہندوستانی وہاں موجود ہیں، آپ نے عربی پڑھی، آپ نے قرآن، سب سے آخری چیز جو [illegible] خدا کا کلام پڑھا، اور پھر اس کو براہ راست اسی زبان میں جس زبان میں اترا تھا، اس میں سمجھنے کی اہلیت پیدا کی، اور آپ نے حدیث پڑھی، اللہ کے رسول کا محفوظ کلام پڑھا، اور پھر آپ نے یہاں رہ کر مجددین کے حالات، مصلحین کے حالات پڑھے، انھوں نے کیسے کیسے نازک زمانے میں ملکوں کو سنبھالا ہے، معاشرے کو سنبھالا ہے، اور بعض اوقات پورے پورے براعظم میں دین پھیلایا ہے، حضرت سید نا عبدالقادر جیلانی کے خلفاء تھے، اس کا انگریز مورخین بھی اعتراف کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ افریقہ میں جو اسلام پھیلا ہے، زیادہ تر قادری سلسلے کے مشائخ سے پھیلا ہے، ابھی انڈونیشیا، ملیشیا جو آپ کے قریب ہمسایہ ملک ہیں، یہاں اسلام کس کے ذریعے سے پھیلا؟ حضر موت کے سادات، اور حضر موت کے تجار اور یہ عرب کے ساحل کے قریب کے رہنے والے، وہاں گئے، یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اس کا ایک ثبوت بھی نہیں ہے کہ کوئی اسلامی لشکر انڈونیشیا اور ملیشیا وغیرہ گیا ہو، اور وہاں اس کے ذریعہ سے اسلام پھیلا ہو،

جنکو فی اسلامی لشکر نے چھین گیا ہے اور نہ ہی یہاں ان علاقوں میں گیا ہے۔ جن کا میں نے ابھی نام لیا، جنوبی ایشیا کے یہ ملک ہیں، یہ ان مسلمان تاجروں اور سادات، اور طریقۂ غزائیہ کے شیوخ اور دوسرے شیوخ کے ذریعے سے مسلمان ہوئے۔

تحفظ دین کا عہد کیجیے!

تو آپ کی اس میں جو کچھ کہیے، کہ جیسے بر بالوالدین ہوتا ہے، بر بالمدرسہ، بر بالاساتذہ اور دین کی نعمت کی قدر دانی اور شکر گزاری یہ ہے کہ آپ یہ بات طے کرلیں کہ یہاں سے نکلنے کے بعد اسلام کو اس ملک سے مٹنے نہیں دیں گے، اور ملت کو اپنے پورے تشخصات کے ساتھ، یہاں تک کہ آج لوگ کہتے ہیں، یہ کہتے تھے ہیں کہ پرسنل لا کے مسئلہ پر اتنا اڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا تھا اگر ہو جاتا اور دو چار نفقہ ملتا؟ یہاں تک لوگ کہنے لگے ہیں بعض ایسے لوگ جو صاحب فکر سمجھے جاتے ہیں۔

لیکن نہیں! امتوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جب تک کہ ان چیزوں پر آدمی نہ ڈٹے جن میں تھوڑی بہت اجازت ہے ہٹنے کی، اس وقت تک ان چیزوں کی بھی حفاظت نہیں ہو سکتی جن کی پوری پوری حفاظت، مکمل حفاظت ضروری ہے۔

تو آپ یہاں سے ارادہ کر کے نکلیں، وقت ہو گیا ہے، میں زیادہ طول بھی نہیں دینا چاہتا، کہ اگر صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کے اعتماد پر کہتا ہوں کہ اگر صرف یہ مجمع، یہاں سے نکلنے والے یہ فیصلہ طے کرلیں کہ ہم اپنی زندگیاں، اپنی توانائیاں، اپنی قوتیں، اپنی محنتیں سب اس پر صرف کر دیں گے کہ یہاں سے اسلام باہر جانے پر مجبور نہ ہو، اور یہاں اپنے پورے تشخص کے ساتھ رہے، اور اپنے علم دین کے ساتھ رہے، یہاں مدارس ہوں، مکاتب ہوں، اور قرآن و حدیث کی تعلیم ہوتی ہو، تو بالکل ممکن ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ حالات میں انقلاب پیدا کردے، اور اس کا سہرا آپ کے سر بندھے، یا کہ دار العلوم کے بانی، اور دار العلوم دیوبند کے بانی، میں ان سب کو کہتا ہوں، ان سب کو ایک کنبہ اور ایک خاندان سمجھتا ہوں، کہ ان کے بانیوں کو اس کا ثواب ملے گا، اور اب جو کچھ امید ہو سکتی ہے وہ ان مدارس کے فضلاء ہی سے

ہو سکتی ہے، باقی سب کا تجربہ ہو چکا، ہمارا اپنے رہنماؤں کا، اپنے مفکرین کا، اور اخبار نویسوں کا، مضمون نگاروں کا، سب کا تجربہ ہو گیا کہ اس پر ان میں وہ ثابت قدمی، اور وہ استقلال نہیں ہے جو ہونا چاہیے، جس کی اگر امید کی جا سکتی ہے تو دراصل عربیہ کے فضلاء سے۔

آپ اپنے طور پر اللہ سے عہد کریں، یہاں نہ کسی اعلان کی ضرورت ہے، اور نہ کسی اظہار کی ضرورت ہے، آپ اللہ سے دعا بھی کریں، اور اللہ سے عہد و پیمان بھی کریں کہ ہم ان شاء اللہ اس دین کے تحفظ کی پوری کوشش کریں گے، اور اپنی پوری صلاحیتیں اس پر لگا دیں گے۔

رزق کا اللہ متکفل ہے

اور یہ میں آپ سے، اذان ہو رہی ہے، اس اذان کی برکت و حرمت کے سایہ میں، اس کی آواز کے سایہ میں کہتا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کو فاقے سے نہیں رکھے گا، اور آپ کو دوسروں سے زیادہ عزت کے ساتھ کھلائے گا ان شاء اللہ، اور آپ کے دسترخوان پر وہ لوگ ہوں گے کہ جو رئیسوں کے دسترخوان پر نہیں ہوتے، ان گنہگار آنکھوں نے دیکھا ہے، مولانا مدنی کا دسترخوان دیکھا ہے، حضرت شیخ الحدیث کا دسترخوان دیکھا ہے، اپنے بزرگوں کے دسترخوان دیکھے ہیں، کیا کسی امیر کو نصیب ہوں گے ایسے معزز مہمان، اور ایسے کثیر التعداد مہمان، اور ایسے کثیر الانواع اطعمہ، کہ جو ان کو نصیب تھے۔

تو آپ بالکل اطمینان رکھیے کہ رزق کا اللہ تعالیٰ متکفل ہے، اور اس کے لیے آپ اپنی یہ بضاعت، اپنا یہ سرمایہ جس کا آپ نے بڑے تفاخر کے ساتھ اور بڑے تشکر کے جذبہ کے ساتھ ذکر کیا ہے، اس کو آپ ان چھوٹی چھوٹی نوکریوں پر جو خلیج میں، سعودی عرب میں مل جاتی ہیں، یا یہاں جو آپ انگریزی پڑھ کر کے کہیں کسی کالج میں لگ جائیں، کسی اسکول میں آپ لگ جائیں، اس پر آپ اس کو قربان نہ کریں، اس کی قیمت صرف اللہ ادا کر سکتا ہے، اور اس کی قیمت صرف اللہ کے پاس ہے، اور وہ کیا ہے؟ ﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرُ﴾ (۱)

(۱) سورۃ التوبۃ: ۷۲

بس میں اس پر ختم کرتا ہوں، اللہ تبارک وتعالیٰ توفیق دے ہمارے ان عزیزوں کو، کہ ان میں سے جی تو چاہتا ہے کہ کل سو فیصدی، لیکن اس میں سے ان کی بیشتر تعداد، ان کی اکثریت اس بات کا عہد کرے کہ ہم انشاء اللہ اپنی ساری توانائیاں لگادیں گے دین کی حفاظت میں، اور ملت کے تشخص کی حفاظت میں، اور اس ملک کو اسپین نہیں بننے دیں گے، بلکہ ہوسکتا ہے ہم اللہ سے دعا کریں گے کہ یہاں اسلام کے قبول کرنے کا دروازہ کھلے، اور اس کے بھی آثار ہیں، میں آپ کو صاف بتادیتا ہوں کہ ہوسکتا ہے کہ بالکل خارق عادت طریقے پر یہ بات ظاہر ہو، اس سلسلے میں اتنا عرض کردوں کہ میرے پاس خطوط آرہے ہیں اور اخبارات بھی کہ جن لوگوں نے بابری مسجد کو شہید کیا، اُن میں بڑی تعداد پاگل ہورہی ہے، اور پھر ان میں سے بہت سے وہ جو دعاؤں کے ذریعے پھر ٹھیک ہوگئے، تو وہ اسلام قبول کررہے ہیں، اس کے لیے اس کی بھی شہادتیں پیدا ہورہی ہیں، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت سے، اور اس کا جو دین سے تعلق ہے، اس کے لحاظ سے یہ بات کوئی بعید از قیاس نہیں ہے، اور ناممکن نہیں ہے، لیکن آپ ارادہ کریں اور اپنی زندگیوں کے متعلق فیصلہ کریں، پھر اللہ تعالیٰ ہر چیز کا متکفل ہے وھو خیر الرازقین، و صلی اللّٰہ تعالی علی خیر خلقه سیدنا و نبینا محمد و علی آله و صحبه اجمعین۔[1]

---

(۱) تعلیمی سال کے اختتام کے موقع پر ۱۵/جنوری ۱۹۹۳ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فارغ ہونے والے طلبہ کے سامنے کی گئی تقریر، یہ تقریر ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے قلمبند کی گئی۔ (مرتب)

وقت کا جہاد

ایک وصیت

فرزندان عزیز! میں اس مجلس کے لیے اور یہاں سے فارغ ہو کر جانے والوں کے لیے اس سے بہتر پیغام اور اپنے مطالعہ و معلومات اور اپنے علمی ذوق و جستجو میں اس سے بڑھ کر کوئی وصیت نہیں پاتا جس میں حضور اکرم (ﷺ) نے سفر پر جانے والے صحابہ کرامؓ سے فرمایا تھا: "أَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِيْنَكَ وَأَمَانَتَكَ وَخَوَاتِيْمَ عَمَلِكَ" (میں اللہ کے حوالے کرتا ہوں تمہارا دین، اور تمہاری امانت، اور تمہارے خواتیم اعمال)۔

ان الفاظ میں 'امانت' کا لفظ ایسا ہے جس کے مفہوم کو ایک مفرد لفظ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، ضمیر کی بیداری، احساس فرض، فرائض کی ادائیگی، اللہ تعالیٰ کا خوف، انسانوں سے محبت، احکام الٰہی کا احترام اور ان پر عمل، یہ سب مفاہیم اسی ایک لفظ میں شامل ہیں، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا﴾[1] (ہم نے (بار) امانت آسمانوں اور زمین پر پیش کیا تو انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا، اور اس سے ڈر گئے، اور انسان نے اس کو اٹھا لیا، بے شک وہ ظالم اور جاہل تھا)۔

دین، امانت اور حسن خاتمہ

عزیزو! میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ ان تینوں چیزوں کو گرہ میں باندھ لیجیے، بلکہ لوح

(۱) سورۃ الأحزاب: ۷۲

دل پر لکھ لیجیے: دین، امانت اور حسن خاتمہ۔ ان میں خواتیم اعمال کی ذمہ داری آپ پر اس طرح کی نہیں ہے جس طرح کی دین و امانت کی ذمہ داری آپ پر ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے کرنے کی چیز ہے، لیکن اس کے لیے بھی کچھ اسباب ہیں۔ کچھ صفات و خصوصیات ہیں جن کا آپ کے اندر ہونا ضروری ہے، وہ ہے آپ کا طرز عمل، آپ کا عقیدہ اور آپ کا عمل ہوگا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حسن خاتمہ کا فیصلہ ہوگا، وہی حسن خاتمہ نصیب کرے گا، شرط یہ ہے کہ ان بنیادی صفات سے آپ متصف ہوں جن پر حسن خاتمہ کا انحصار ہے۔

عزیزو! میں صاف صاف آپ سے کہتا ہوں، اور اس میں کسی اشارے کنایے سے کام نہیں لیتا، کہ آپ نماز پنج گانہ کی پابندی کریں، نوافل و تسبیحات کو بھی ترک نہ کریں، تاکہ معلوم ہو کہ آپ کسی دینی درسگاہ سے پڑھ کر آئے ہیں، مسجد کی طرف جاتے ہیں، بلکہ تمام کاموں میں ثواب کی نیت کریں، میں یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ جو منزلیں اور جو امتحانات اور آزمائشیں آپ کو پیش آنے والی ہیں، اور یہ ملک، بلکہ ملت اسلامیہ جس راستہ سے گزر رہی ہے، پھر معاشی ذمہ داریاں، خاندان کی پرورش کا مسئلہ ہے، پھر جو اخلاقی بیماریاں اور امراض ہیں، وہ سب نماز کی ادائیگی میں فرق پیدا کر سکتے ہیں، اور اس کی طرف سے توجہ ہٹا سکتے ہیں۔

مسلک ولی اللہی کو اپنا دستور العمل بنائیں!

مگر اس نماز سے بھی پہلے بنیادی اہمیت عقیدۂ توحید کی ہے کہ آپ کا عقیدہ خالص اور بے آمیز توحید کا عقیدہ ہو، اس سلسلہ میں مسلک ولی اللہی آپ کا معیار اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی کتاب "تقویۃ الایمان" آپ کا دستور العمل ہو، اسی عقیدہ پر ہماری جماعت کی بنیاد پڑی ہے، اس دور میں کم سے کم ہندوستان بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ایشیا اور پورے مشرق میں جو فکر سب سے زیادہ عمیق، اور علمی بنیادوں پر استوار اور اسلام کی کلی تعبیر اور صحیح تعبیر کے لحاظ سے، تیز سب سے زیادہ مفید، قابل عمل اور وقت کے اعتبار سے زندہ اور طاقتور بھی ہے، وہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی فکر اور ان کا مسلک ہے، شاہ ولی اللہ کے مسلک سے بہتر کوئی مسلک نہیں۔

آپ "حجۃ اللہ البالغۃ" کا مطالعہ بھی کریں جس میں نظام معیادات کی مربوط تشریح کی

گئی ہے، ہماری کتاب 'تاریخ دعوت وعزیمت' کا وہ حصہ خاص طور پر پڑھیں جو شاہ ولی اللہ دہلوی سے متعلق ہے، اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ فکر ولی اللہی سے بڑھ کر ترقی یافتہ، عالمانہ، محققانہ، حقیقت پسندانہ کوئی اور مکتب تجدید، اصلاح اور مکتب دعوت نہ صرف ہندوستان میں، بلکہ پورے عالم اسلام میں نہیں، پورے عالم اسلام میں اس کی نظیر نہیں، آپ اس مسلک کو اپنائیں اور اس کو دستور العمل بنائیں۔

زہد واستغناء

تیسری بات یہ ہے کہ آپ زہد واستغناء کی ایسی مثال قائم کریں کہ بڑی سے بڑی حکومت وسلطنت آپ کو نہ خرید سکے، اس دین کے اب تک باقی رہنے کا ایک راز یہ بھی ہے کہ ربانی وحقانی علماء کو آج تک کوئی خرید نہیں سکا، شیخ سعید حلبی کا مشہور واقعہ ہے کہ وہ جامع اموی میں بیٹھے درس دے رہے تھے، ان کے پاؤں میں تکلیف تھی جس کی بنا پر پاؤں پھیلائے ہوئے تھے کہ اتنے میں شام کا گورنر آیا جو بڑا سفاک اور جبار قسم کا حکمراں تھا اور معمولی بات پر گردن اڑا دیا کرتا تھا، شیخ اسی حالت میں درس دے رہے تھے کہ گورنر اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ آیا، وہ کچھ دیر تک حلقۂ درس کے پاس کھڑا دیکھتا رہا، شیخ بے نیازی سے اپنے کام میں مصروف تھے، یہ صورت حال دیکھ کر طلبہ نے اپنے کپڑے سمیٹ لیے کہ کہیں اس مجلس میں ہمارے شیخ کی گردن نہ اڑا دی جائے جس کے خون کے چھینٹے ہمارے کپڑوں پر پڑ جائیں، گورنر تھوڑی دیر کھڑا رہ کر واپس چلا گیا، اس نے وہاں سے اشرفیوں کا توڑا شیخ کو بھیجا کہ یہ قبول کر لیں، شیخ نے یہ توڑا یہ کہتے ہوئے واپس کر دیا کہ اپنے آقا سے سلام کہنا اور یہ کہنا کہ "جو پاؤں پھیلاتا ہے وہ ہاتھ نہیں پھیلاتا"۔ سَلِّمْ عَلٰى مَوْلَاكَ وَ قُلْ لَهٗ: مَنْ يَمُدُّ رِجْلَهٗ لَا يَمُدُّ يَدَهٗ!۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا واقعہ

اسی طرح کا ایک قصہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا ہے، کہ ان کو سردیوں میں دھوپ

لینے کی ضرورت تھی، سڑک کے کنارے کی طرف پاؤں پھیلائے ہوئے بیٹھے ہوئے تھے، معلوم ہوا کہ بادشاہ کی سواری گزرنے والی ہے، لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت! ابھی بادشاہ کی سواری گزرنے والی ہے، آپ پاؤں سمیٹ لیتے تو اچھا تھا، آپ نے یہ سن کر بڑا بلیغ جملہ کہا: "جو ہاتھ سمیٹ لیتا ہے، اس کو پاؤں سمیٹنے کی ضرورت نہیں" یعنی بادشاہ کی مدد سے جو ہاتھ سمیٹ لے، اس کی کوئی مدد قبول نہ کرے، تو پھر اس کو پاؤں سمیٹنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

اپنے ضمیر کو آزاد رکھیں

آپ اپنے کو پوری طرح آزاد رکھیے، کسی حکومت کی سرپرستی اور کسی مالی سرچشمہ اور سرپرستی سے آزاد رہیے، اس وقت یہ عام ہوا چلی ہوئی ہے کہ عربی پڑھنے والے خلیجی ملکوں میں اور خاص طور پر سعودی عرب جاتے ہیں تاکہ بڑی نوکری کی تلاش کریں، میں بڑی صفائی سے کہتا ہوں کہ اس امت کا سب سے بڑا فریضہ اور وقت کا جہاد یہ ہے — جس کی اللہ کے یہاں بڑی قدر و قیمت ہوگی — کہ آپ بلاد عربیہ دعوت دینے کے لیے جائیں، جہاں سے ہمیں ایمان کی دولت ملی، ان عربوں کو ان کا فریضہ یاد دلانے کے لیے جائیں، آپ کے عربی پڑھنے کی یہی قیمت ہے، الحمد للہ یہاں ایسا لٹریچر تیار ہو گیا ہے جس نے وہاں تک ہماری آواز پہنچائی، عرب قوم پرستی کے خلاف سب سے زیادہ موثر اور طاقتور آواز ندوۃ العلماء سے بلند ہوئی۔

عزیزو! آپ اپنے ضمیر کو آزاد رکھیں، اور اپنے جسم کو بھی آزاد رکھیں، اس وقت بہت بڑا خطرہ پیدا ہو گیا ہے، وہ خطرہ یہ ہے کہ اماموں اور مؤذنوں کی تنخواہوں کے لیے باقاعدہ تحریک چلائی جا رہی ہے کہ انہیں حکومت کے خزانے سے تنخواہیں اور تمام سہولتیں دی جائیں، اس کا مطلب یہی ہوگا کہ اماموں سے الیکشن کے موقع پر کام لیا جائے گا، مسلم پرسنل لا بورڈ کے خلاف کام لیا جائے گا، اس لیے کہ جب مساجد محکمہ اوقاف کے ماتحت ہوں گی، اور وہ سرکاری ملازم قرار پائیں گے، تو ایسے ائمہ مساجد کے منبروں سے آزادی کے ساتھ دین کی بات نہیں کہہ سکیں گے، اس لیے آپ اپنے دین کی حفاظت کیجیے، عقائد کے لحاظ سے بھی، اور اعمال کے لحاظ سے بھی، حقوق کے لحاظ سے بھی، اور فرائض کے اعتبار سے بھی۔

اصلاح معاشرہ اور آپ کی ذمہ داریاں

اُمَّتِ اَنْتُمْ کا مطلب یہ ہے کہ ملت کی طرف سے، اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی طرف سے آپ پر کیا ذمہ داریاں ڈالی گئی ہیں، ملت کن خطرات سے گزر رہی ہے، کس وادی پر خار سے وہ گزر رہی ہے، آج مسلم پرسنل لا بورڈ کو مٹانے کی کیسی کیسی کوششیں کی جارہی ہیں، مشرکانہ تعلیم کے ذریعہ، جبری طور پر نئی نسل کو کس طرح نئے سانچے میں ڈھالنے کی سرتوڑ کوشش ہو رہی ہے، اور یہ منصوبہ ہر جگہ تیار ہے کہ مسلمان صرف نام کے باقی رہیں، باقی ان کی تمام خصوصیتیں ختم ہو جائیں، اس ملک کو اسپین بنانے کی زبردست سازش کی جارہی ہے۔

آپ کو اصلاح معاشرہ کا کام بھی کرنا ہے، کہ یہ بھی (دِفَــــــنَکُمْ) میں شامل ہے، اس وقت جاہلی رسوم و رواج وبا کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ دولت پرستی اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ معمولی چیز کی خاطر جانیں لی جارہی ہیں، آپ کو اس کے خلاف بھی مہم چلانی ہے۔ بلکہ اس مہم کی پوری ذمہ داری آپ کو قبول کرنی ہے، پھر ثقافتی اور فکری لحاظ سے ہندوستان میں ملت اسلامیہ کی آپ کو حفاظت کرنی ہے، رسم الخط اور کلچر کے لحاظ سے بھی اور زبان کے اعتبار سے بھی، اگر آپ قربانیاں دیں گے، زہد و استغناء سے کام لیں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے گا، یہ ملت اپنے تشخصات کے ساتھ باقی رہے گی۔

حفاظت دین کا وعدہ

اور یہ دین باقی رہنے ہی کے لیے آیا ہے، اس وقت یہودیت، عیسائیت، ہندوازم، بودھ ازم، یہ تمام ادیان و مذاہب نہ صرف بدل گئے، بلکہ ان کی اصل شکل ایسی بگڑ گئی کہ ان کو پہچاننا ناممکن ہو گیا ہے، پھر ان مذاہب و ادیان میں طویل عرصہ سے اصلاح و تجدید کی کوئی تحریک نہیں اٹھی، اسی وجہ سے یہ سب مٹ گئے، صرف اسلام اپنی اصل شکل میں روح کے ساتھ باقی ہے، عقائد سے لے کر فرائض تک، سنن سے لے کر مستحبات تک، اخلاق سے لے کر معاملات اور تہذیب تک سب باقی ہے، قرآن باقی ہے اور اس کی زبان باقی ہے، اس

چونکہ وہ عیسائیت کے رد میں مناظرے بھی کرتے تھے، اس سے ان کو اندازہ ہوا کہ انگریزی زبان سے اور انگریزی مصنفین کے اسالیب سے واقفیت ضروری ہے، چونکہ مستشرقین ایک خاص مقصد کے لیے کام کر رہے تھے، اور بڑی ذہانت اور ہوشیاری سے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کو متاثر کر رہے تھے، اس لیے کہ وہی طبقہ برسر اقتدار میں آتا ہے، بلادِ عربیہ میں اس وقت وہی طبقہ برسر اقتدار ہے جو یورپ و امریکہ کا تعلیم یافتہ ہے، اس لیے ایسی صورت میں جمعیت اس کی خاص طور سے تیاری کرلی ہوگی کہ ایسا لٹریچر تیار کریں جو تعلیم یافتہ ذہنوں کو متاثر کرے، اور اسلام کی برتری میں انسانی قیادت کی صلاحیت پر ایمان ان کے دل و دماغ میں راسخ کرے، اس طبقہ کو مطمئن کرنے کی تیاری بھی آپ کے ذمہ ہے، حالات اور رجحانات کا برابر مطالعہ کرتے رہنا بھی ندوی فضلاء کی ذمہ داری ہے، آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ طبقہ کون سی زبان سمجھتا ہے، کون سے دلائل اس کے سامنے پیش کرنے چاہئیں، کس اسلوب میں اس سے گفتگو کرنی چاہیے۔

اس مجلس میں جن عزیزوں نے اپنے تاثراتی مقالے عربی اور اردو میں پیش کیے اور تقریریں کی گئیں، وہ ہماری توقع سے بڑھ کر تھیں، امید ہے کہ استعداد نہ صرف قائم رہے گی، بلکہ مزید ترقی کرے گی۔(۱)

---

(۱) دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فارغ ہونے والے طلبہ کے سامنے ۹ دسمبر ۱۹۹۶ء کو کی گئی تقریر، یہ تقریر مولانا عبدالحفیظ تقی ندوی نے قلمبند کی، ماخوذ از "تعمیر حیات" لکھنؤ (شمارہ ۲۵ دسمبر ۱۹۹۶ء)

فارغین ندوہ کی ذمہ داریاں

برادرانِ گرامی قدر، اور عزیز فرزندانِ دار العلوم ندوۃ العلماء!

عرصہ سے یہ خیال دل میں آرہا تھا کہ آپ سے خاص باتیں کروں، تاہم اس لیے کہ آپ اپنے شہروں بلکہ دور دور ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں کہ سب کا جمع ہونا ناممکن ہے، آپ میں کچھ ایسے حضرات ہوں گے جن کو دار العلوم چھوڑے ہوئے چالیس پچاس سال ہو چکے ہوں گے، جن کو دوبارہ دار العلوم آنے اور دیکھنے کا موقع نہ ہوگا، کچھ کو نہیں، دار العلوم چھوڑے ہوئے جو مدت بھی گزری ہو لیکن طالب علمی کے زمانے کی باتیں اور یادیں اب بھی طالب علموں کے ذہن میں تازہ ہوں گی، اور طالب علمانہ شوخیوں اور شرارتوں سے لے کر نوک جھونک، تعلیل نہیں بلکہ تحصیل، بحث و مباحثہ، مقابلہ جات اور "الاصلاح" کے اسٹیج پر تقریری مقابلے اور دار العلوم کا ایک خاص ماحول، دور دراز سے آئے ہوئے کے مناظر بھی آنکھوں میں اسی طرح پھر رہے ہوں گے جیسے ابھی کل کی بات ہے۔

جو جانے کے بعد اب تک نہ آسکے، ان کے تصور و خیال میں دار العلوم جس ظاہری صورت میں ہوگا جواب تک ایک تغیر و حرکت میں رہا ہے، اور معنوی اعتبار سے عرب و عجم میں اس کا چرچا ہے، اس کا نام ادب و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے، آپ جب یہاں رہتے ہوں گے تو آپ کو یہ محسوس کرنے کا یقین نہیں رہا ہوگا کہ یہ کتنی بڑی بات ہے، اسی کے گھرانے اور خاندان کے بہت محدود ماحول میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے، لیکن جو بہرحال ایک فخر ہوتا ہے اس کے نقوش ذہنوں سے محو نہیں ہوتے، اور زندگی کے ہر مرحلے میں اس کی قدر کا احساس ہوتا ہے، آپ اپنے مادرِ علمی سے نکل کر دنیا کے مختلف ملکوں، اور زندگی کے مختلف شعبوں میں پھیل گئے ہیں، آپ

امریکہ میں بھی ہیں، برطانیہ میں بھی، آپ افریقہ میں بھی ہیں اور مصر و حجاز میں بھی، خلیج و امارات میں بھی ہیں، انڈونیشیا و ملیشیا میں اور نیپال و پاکستان میں بھی۔ آپ یونیورسٹی اور کالجوں میں بھی ہیں اور مدارس و مکاتب میں بھی۔ آپ میں سے بہت مختلف ملکوں میں مسجدوں کے خطیب و امام بھی ہیں، آپ میں مصنف و مؤلف بھی ہیں جو ذہنوں کی تشکیل اور اسلام کی وکالت کا فریضہ انجام دیتے ہیں، کسی ادارہ کے لیے یہ بڑے شرف کی بات ہے کہ اس کے ہونہار سپوت زندگی کے مختلف میدانوں شعبوں میں اس طرح کام کر رہے ہوں۔

آپ نے دار العلوم میں رہ کر ندوۃ العلماء کے معتدل، متوازن فکر پر پورے تقریریں کی اور سنی ہوں گی، لیکن اب جبکہ آپ زندگی کے میدان میں ہیں، اس معتدل اور متوازن فکر سے کتنا کام لے رہے ہیں، اس پر غور کرنا چاہیے، اس کا جائزہ بھی لینا چاہیے کہ اس فکر پر حالات اور ماحول کا گرد و غبار تو نہیں پڑ گیا ہے، اور اس کے ساتھ اس کو تازہ کرنے کے لیے اپنے مادر علمی سے ایک فرزند صالح کی طرح تعلق و رابطہ رکھنا چاہیے، اور یہاں کے پیغام و لٹریچر کو دور دور تک پہنچانے کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے، کہ اس کی ضرورت آج کل سے بھی زیادہ ہے، اور جتنا زمانہ گزرتا جا رہا ہے ندوۃ العلماء کے مسلک اور طرز دعوت کی ضرورت بڑھتی جائے گی، ذہن میں تازہ رکھنے کے لیے ندوۃ العلماء کے مسلک کو ہم پھر سے دہراتے ہیں۔

ندوۃ العلماء کا مسلک

"دین و عقائد کے معاملہ میں ندوۃ العلماء کے مسلک کی بنیاد دین خالص پر ہے، جو ہر قسم کی آمیزش اور آلائش سے پاک رہا ہے اور تحریف سے بلند، بدعات اور فریب کی سرحدوں سے دور، اور ہر اعتبار سے مکمل اور محفوظ ہے۔

دین کی فہم اور اس کی تشریح اور تعبیر میں اس کی بنیاد اسلام کے اولین اور صاف و شفاف سرچشموں سے استفادہ اور اس کی اصل کی طرف رجوع پر ہے۔

اعمال اور اخلاق کے شعبہ میں دین کے جوہر و مغز کو اختیار کرنے اور اس پر مضبوطی سے

قائم رہنے، احکامِ شریعت پر عمل، حقیقتِ دین اور روحِ دین سے زیادہ قربت اور تقویٰ کی اور اصلاح پر ہے۔

تصورِ تاریخ میں اس کی بنیاد اس پر ہے کہ اسلام کے ظہور اور عروج کا دورِ اول سب سے بہتر اور قابلِ احترام دور، اور وہ نسل جس نے آغوشِ نبوت اور درس گاہِ رسالت میں تربیت پائی، اور قرآن وایمان کے مدرسہ سے تیار ہو کر نکلے سب سے زیادہ مثالی اور قابلِ تقلید نسل ہے، اور ہماری سعادت ونجات اور فلاح وکامرانی اس بات پر منحصر ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ ان سے استفادہ کریں، اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کریں۔

نظریۂ علم وفلسفۂ تعلیم میں اس کی بنیاد اس پر ہے کہ علم بذاتِ خود ایک اکائی ہے، جو قدیم وجدید اور مشرق ومغرب کے خانوں میں تقسیم نہیں کی جا سکتی، اگر اس کی کوئی تقسیم ممکن ہے تو وہ صحیح اور غلط، مفید اور مضر، اور نتائج اور مقاصد کے اعتبار سے ہوگی۔

استفادہ اور اخذ ورد، ترک وقبول کے شعبہ میں اس کا عمل اس حکیمانہ نبوی تعلیم پر ہے کہ "حکمت مومن کا گم شدہ مال ہے، جہاں بھی وہ اس کو پائے وہ اس کا سب سے زیادہ مستحق ہے" نیز قدیم حکیمانہ اصول "خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَدِرَ" پر، (یعنی جو صاف ونظیف ہو اس کو لے لو، اور جو آلودہ اور کثیف ہو اس کو چھوڑ دو)۔

اسلام کے دفاع اور عصرِ حاضر کی بے دینی قوتوں کے مقابلہ میں اس کی اساس اس ارشادِ ربانی پر ہے کہ ﴿وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ﴾[1] (ان کے مقابلے کے لیے جتنی قوت تم سے ممکن ہو سکے، تیار کرو)۔

دعوت الی اللہ، اسلام کے بیان اور فضائل کی تشریح، اور ذہن وعقل کو اس کی حقانیت وصداقت پر مطمئن کرنے میں اس کا عمل اس نبوی حکیمانہ وصیت پر ہے کہ "كَلِّمُوا النَّاسَ عَلَى قَدْرِ عُقُولِهِمْ، أَتُرِيدُونَ أَنْ يُكَذَّبَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ؟" (لوگوں سے ان کی عقلوں کا خیال رکھتے ہوئے گفتگو کرو، کیا تم چاہتے ہو کہ خدا اور رسول کو جھٹلا دیا جائے؟)۔

عقائد وسلوک میں وہ جمہور اہلِ سنت کے مسلک کی پابندی اور سلف کے آثار اور

(۱) سورۃ الانفال: ۶۰

تحقیقات کے دائرہ میں محدود رہنا ضروری سمجھتا ہے، فروعی و فقہی مسائل کے بارے میں اس کا مسلک و اصول یہ ہے کہ حتی الامکان اختلافی مسائل کو چھیڑنے اور ہر ایسے طرزِ عمل سے احتراز کیا جائے جس سے باہمی منافرت بڑھے، اور امت کا شیرازہ منتشر ہو، سلف صالحین سے حسن ظن رکھا جائے، اور ان کے لیے عذر تلاش کیا جائے، اسلام کی مصلحتِ اجتماعی کو ہر مصلحت پر ترجیح دی جائے۔

مختصر یہ کہ وہ حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (م ۱۱۷۶ھ) کے علمی و فکری اور کلامی و فقہی مدرسۂ فکر سے زیادہ قریب اور ہم آہنگ ہے، اس لحاظ سے ندوۃ العلماء ایک محدود تعلیمی مرکز سے زیادہ ایک جامع اور کثیر المقاصد دبستان فکر اور مکتب خیال ہے"۔

آپ کی ذمہ داریاں

ہماری خواہش و تمنا یہ رہتی ہے کہ آپ جہاں کہیں بھی ہوں، اپنے مرکز اصلی اور مادر علمی سے برابر رابطہ قائم رکھیں، اس کے حالات و ضرورتوں سے باخبر رہیں، یہاں سے نکلنے والے اخبار و رسائل کا مطالعہ ضرور کرتے رہیں کہ یہ رابطہ کا ایک مناسب ترین ذریعہ بھی ہے، اور اس سے ندوۃ العلماء کا کام و پیغام بھی تازہ ہوتا رہے گا، ندوۃ العلماء، حالات و خطرات کا جس طرح مقابلہ کرتا ہے، فکر اسلامی کو نمایاں اور واضح کرتا ہے، اٹھنے والے ابھرنے فتنے کا بلا خوف لومۃ لائم جس طرح مقابلہ کرتا ہے، اس کا نہ صرف یہ کہ آپ کو علم ہوتا رہے گا، بلکہ اس سے آپ کی بجھی اور دبی ہوئی امنگوں میں حرارت و زندگی بھی پیدا ہوگی، جس کو زندگی کی ہنگامہ خیزی متاثر کرتی رہتی ہے۔

اس وقت دنیا میں اسلام و مسلمانوں کے خلاف جو تند و تیز ہوائیں چل رہی ہیں، اس سے آپ بخوبی واقف ہیں، ایسے میں آپ جہاں کہیں بھی رہیں اپنا بساط بھر پور ندویت کی ذمہ داری کو نبھائیے، اور اپنے مادر علمی کے وجود کا حق ادا کیجیے۔

کیا اچھا ہوتا کہ آپ جہاں کہیں بھی ہیں، اور جو کچھ بھی ہیں، اس سے اپنے مادر علمی کو باخبر کریں، اور مشورہ کی ضرورت ہو تو مشورہ نیز خود آپ سے وقت ضرورت پر اس علاقہ سے

متعلق، وہاں کے حالات سے متعلق مشورہ لیا جا سکے، جہاں آپ رہتے ہیں۔

اس امید کے ساتھ آپ کو یہ سطریں لکھی جارہی ہیں کہ آپ ماورعلمی سے ایک عرصہ دراز سے بے تعلق رہنے کے حجابات کو ختم کر کے اپنے ربط و تعلق کی تجدید کریں گے، اور اس پر خوب غور کریں گے کہ موجودہ حالات میں جہاں صرف مال و جاہ کی ریس ہے، ایک عالم دین کی حیثیت سے، اپنے سر پر وراثت نبوت کا تاج رکھنے کی حیثیت سے، آپ پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب [1]

---

(۱) ماخوذ از پندرہ روزہ "تعمیر حیات" لکھنؤ، (شمارہ ۱۰/۲۵ نومبر ۱۹۹۱ء و ۱۰/ جنوری ۱۹۹۲ء)۔

اہمیت و ضرورت اور مقاصد

مدارس اسلامیہ کا مقام اور مرتبہ، معاشرہ میں اس کی اہمیت و افادیت،
اس کے خلاف ریشہ دوانیوں کے سد باب کی تدابیر، اس کی جانب
منسوب افراد کی کوتاہیوں اور ان کی ذمہ داریوں کا ایک جامع مرقع

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

[illegible] ندوی

سید احمد شہید اکیڈمی
دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی